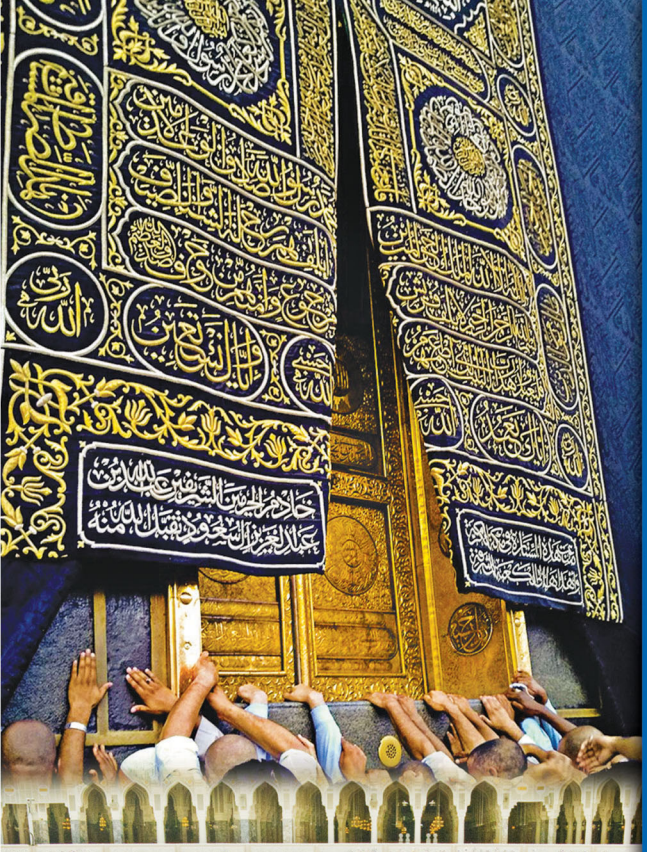

سورۃ الاخلاص کا پیغامِ توحید

تالیف

حافظ جلال الدین قاسمی

فاضل دارالعلوم دیوبند ایم اے میسور یونیورسٹی (انڈیا)

نظرثانی و تنقیح

ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن

تخریج و تحقیق

مولانا محمد ارشد کمال

مکتبہ افکارِ اسلامی

سورۃ الاخلاص
کا
پیغامِ توحید

تالیف

حافظ جلال الدین قاسمی
فاضل دارالعلوم دیوبند، ایم اے میسور یونیورسٹی (انڈیا)

تخریج وتحقیق
مولانا محمد ارشد کمال

نظر ثانی وتنقیح
ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن

مکتبہ افکارِ اسلامی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نامِ کتاب	:	سورۃ الاخلاص کا پیغامِ توحید
مؤلف	:	حافظ جلال الدین قاسمی (مالیگاؤں، انڈیا)
تخریج وتخریج	:	مولانا محمد ارشد کمال
نظر ثانی وتنقیح	:	ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن
ضخامت	:	۶۴ صفحات
اشاعت (اول)	:	اکتوبر ۱۹۹۴ء
اشاعت دوم	:	مارچ ۲۰۱۵ء
مطبع	:	مکتبہ اسلامیہ پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر	:	مکتبہ افکارِ اسلامی

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 - 37232369

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204 - 2641204

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com www.facebook.com/maktabaislamiapk

انتساب

ان تمام غیور موحدین کے نام
جو توحید کے مقدس دامن پر
شرک و بدعت کی ذرہ برابر بھی آلودگی دیکھنا گوارہ
نہیں کرتے

فہرست مضامین

❀ انتساب.......... 3
❀ ابتدائیہ 7
❀ مقدمہ 8
❀ پیش لفظ از مؤلف 9
❀ سورۃ الاخلاص.......... 11
✿ سورۂ اخلاص کا شانِ نزول 11
✿ فضیلت سورۂ اخلاص.......... 12
✿ سورۃ الاخلاص کا ایک غیر مسلم پر اثر.......... 13
✿ اخلاص کی اہمیت.......... 15
✿ عقیدے میں اخلاص.......... 15
✿ عمل میں حقیقی اخلاص 16
✿ قل کا مفہوم 18
✿ ھُوَ کا مطلب 19
✿ اللہ جل جلالہ 20
✿ اسماء وصفات 24
✿ احد اور واحد میں فرق 24
✿ احد اور واحد کے فرق کی مزید تفصیل 25
✿ لفظ احد سے ثنویت کا رد 26

❀ تفسیر الصمد 30
✿ الصمد سے الوہیتِ مسیح کا رد 31
❀ ولادت کا معنی 34
✿ حیوان متولد وحیوان متوالد 35
✿ ابنیت اور مولودیت کا رد 38
❀ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں 40
✿ خدا کی تین بڑی صفتیں 42
✿ صفات لاعین اور لاغیر ہیں 42
✿ جسم باری تعالیٰ کی بحث 44
✿ مسئلہ خیر وشر 45
✿ اِنَّا اور نَحْنُ کی بحث 46
✿ حلول واتحاد اور تصورِ اوتار کا رد 47
✿ استواء علی العرش 49
✿ رویتِ باری تعالیٰ 52
✿ توحید اور شرک 53
✿ قرآن معلم التوحید ہے 54
✿ اللہ تعالیٰ بے مثال ہے 55
✿ امکان کذب باری محال ہے 57
✿ معطلہ اور مشبہہ کا رد 59
✿ وجود باری پر بحث 60
✿ خلاصہ سورہ اخلاص 61

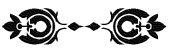

ابتدائیہ

آج تفسیر سورۂ اخلاص کے مسودہ کا جستہ جستہ بغور مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جو حضرت مولانا جلال الدین قاسمی کے علمی وقلمی شاہکار کا بیش بہا خزانہ ہے۔ یوں تو بہتوں نے سورہ اخلاص کی تفسیریں کی ہیں مگر مولانا موصوف نے جس انوکھے واچھوتے انداز میں آیات کے ہر ٹکڑے کی علمی وفکری تشریح کی ہے اسے پڑھ کر مولانا موصوف کے وسعت مطالعہ اور محنت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جو جو صفات اس سورہ میں موجود ہیں اس کے معانی بیان کرنے میں جس لگن کا مظاہرہ کیا ہے، وہ مولانا موصوف ہی کا حصہ ہے مولانا کی نظر بڑی وسیع اور دقیق ہے۔

قاسمی صاحب کی تصنیفی میدان میں غالباً یہ پہلی کوشش ہے جس کی زبان نہایت سادہ عام فہم ہے، ادب وانشاء کی چاشنی سے بھرپور ہے۔

مجھے اُمید ہے علماء طلباء عوام وخواص اس کتاب کو پڑھ کر استفادہ کرکے مصنف کے حق میں ضرور دعائے خیر کریں گے۔ میں تمام اہل علم سے اپیل کرتا ہوں کہ قاسمی صاحب کے منطقی استدلال اور جدید طرز تحقیق سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مصنف ومعاونین ومحسنین کے حسنات کو قبول فرمائے۔ آمین

محمد امین ریاضی

امین عام صوبائی جمعیۃ بمبئی

مقدمہ

زیر نظر کتاب ہمارے فاضل دوست جناب مولانا جلال الدین قاسمی صاحب کی طرف سے میدان تفسیر میں ایک انوکھا قدم ہے۔ تبحر علمی و دقیقہ رسی و دقیقہ سنجی کے لحاظ سے قارئین کے لیے انمول رتن ہے۔ باطل عقائد جیسے تثلیث و مسئلہ حلول اور مشرکین و کافرین کے خرمنِ ضلالت پر رعد و برق ہے۔ عقل سلیم و ذوق علمی نیز جملہ اولوالالباب کے لیے برہان و نور مبین ہے۔ تحریر میں زور ہے، انداز بے باکانہ ہے۔ نتائج منطقیانہ وفلسفیانہ ہیں مگر منہج علماء سلف سے ہٹ کر نہیں۔ تحریر فصاحت و بلاغت سے پُر، معانی و بدیع سے لبریز، تمثیلات و تشبیہات کی آئینہ دار ہے۔ یہ تفسیر آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کردے گی کہ یقیناً بلاریب ومنون اللہ احد ہے۔ اللہ صمد ہے۔ نیز جب آپ یہ کتاب بند کریں گے تو آپ کے دل پر یہ نقش ہو چکا ہوگا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾ (الشوریٰ: ۴۲/ ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

جس طرح غواص سمندر کی گہرائیوں سے موتی حاصل کرتا ہے بالکل اسی طرح آپ موصوف کے فکری بحر بیکراں سے صرف اور صرف توحید کے موتی حاصل کریں گے۔ ان شاء اللہ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے موحد دوست کی طرف سے پیش کی گئی اس سعی جمیل کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین

نیاز احمد حسرت علی گورکھپوری

وکیل الجمیعة المحمدیة وتوابعها، شارع جروا تلسی پور، غونڈہ

پیش لفظ از مؤلف

اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں اسی پر بس نہیں کیا کہ مجھے رب مانو اور مجھے معبود مان کر اپنی جبین نیاز کے سارے سجدے میرے آستاں کے لیے مخصوص کردو بلکہ کرّات مرات عنوانات اور اسالیب بدل بدل کر مثالیں دے دے کر یہ بھی فرمایا ہے کہ میں اپنی ذات اور صفات میں یکتا ہوں، کائنات کی تمام مخلوق میری محتاج ہے اور ہر کوئی میرے در کا سوالی ہے، نیز مجھ جیسا کوئی نہیں اور میری خدائی میں کوئی شریک نہیں۔

اسی عقیدے کا نام توحید ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے اردگرد ایمان، اسلام، اخلاق کے تمام تقاضے گردش کرتے ہیں۔ ایمان و اسلام کی بنیاد توحید ہی ہے۔ اس بنیاد میں اگر فرق آ گیا اور یہ عقیدہ خدانخواستہ مجروح ہوگیا تو پھر ایمان و اسلام، عبادات وتقویٰ سب کے سب عنداللہ معتبر قرار پائیں گے۔

تمام انبیائے کرام کی بعثت کی غرض و غایت یہی تھی کہ انسانوں کے سامنے اس عقیدہ کو پہلے پیش کریں چنانچہ یہ نفوس قدسیہ اپنی بعثت سے لے کر تادمِ واپسیں توحید ہی کا درس دنیا کو دیتے رہے، توحید ہی ان کی دعوت وتبلیغ کا نقطۂ آغاز تھا، نقطۂ وسط بھی اور نقطۂ اختتام بھی۔

دین میں توحید کی اسی اہمیت اور مقام و مرتبہ کی وجہ سے اللہ نے ایک مکمل سورہ ''سورۃ الاخلاص'' کے نام سے نازل کی جس میں توحید خالص سے بحث کی گئی ہے۔ اس سورہ کا انداز انتہائی سلیس، واضح، آسان اور عام فہم ہے۔ اختصار کے ساتھ ساتھ کمال جامعیت موجود ہے۔ اس مضمون کو علیحدہ ایک سورت میں انتہائی اختصار کے ساتھ ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ معمولی ذہن رکھنے والے آدمی کے لیے بھی اسے حرزِ جان بنانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

اس سورہ کریمہ کی تفسیر متعدد علماء نے کی ہے اور ان میں سب سے عمدہ تفسیر امام ابن

تیمیہ رحمہ اللہ کی ''تفسیر سورۃ الاخلاص'' ہے۔ درحقیقت حضرت نور اللہ مرقدہ کی یہ کتاب خزینۂ اسرار وحکم اور گنجینہ علوم ومعارف ہے مگر چونکہ یہ کتاب عربی میں ہے اس لیے اس کے مضامین تک عوام کی رسائی نہیں ہوسکتی لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ ایک ایسی کتاب مرتب کروں جس میں اس سورہ کریمہ کے متعلق لکھی گئی بہت سی تفاسیر کے اہم اجزاء جمع ہوجائیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں مَیں نے بہت محنت کی ہے۔ علمی فرومائیگی کے ساتھ ساتھ مراجع کی کمیابی کا احساس بھی برابر دامن گیر رہا ہے۔

میں قطعاً یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میری یہ کتاب غلطیوں اور نقائص سے پاک ہے کیونکہ غلطیوں اور نقائص سے مبرا اور نسیاں سے پاک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

جلال الدین قاسمی

۲۲ ستمبر ۱۹۹۴ء مطابق ۱۵ ربیع الآخر ۱۴۱۵ھ

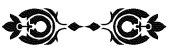

سورۃ الاخلاص

آیاتھا ۴ (۱۱۲) سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ (۲۲) رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ① اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ② لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ ③ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ④﴾

''کہہ دیجیے کہ وہ اللہ احد ہے۔ اللہ صمد ہے۔ نہ وہ والد (باپ) ہے نہ وہ مولود (بیٹا) ہے نہ کوئی اس کی برابری کا۔''

منظوم ترجمہ:

تم کہہ دو اے محمد! میرا خدا ہے یکتا
ہے بے نیاز سب سے، بیٹی نہ اس کا بیٹا
ماں باپ بھی نہ اس کے ہمسر نہ کوئی اس کا

سورۂ اخلاص کا شانِ نزول

ابوجعفر رازی نے یہ حدیث ربیع بن انس رضی اللہ عنہ اور انھوں نے ابی بن کعب سے روایت کی ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں اپنے رب کا نسب بتاؤ اس پر اللہ نے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ① اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ②﴾ کی سورۂ مبارکہ نازل کی۔ [1]

[1] ترمذی، التفسیر، ومن سورة اخلاص، رقم: ٣٣٦٤۔ ابوجعفر کی ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ضعیف ہوتی ہے۔

اس سورت مبارکہ کے شان نزول کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مواقع پر مختلف لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس معبود کی ماہیت اور کیفیت دریافت کی تھی، جس کی عبادت کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے اور ہر موقع پر آپ نے اللہ کے حکم سے یہی سورہ سنائی۔ سب سے پہلے آپ ﷺ سے یہ سوال مشرکین مکہ نے کیا تھا اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ میں کبھی یہودیوں نے کبھی عیسائیوں نے اسی طرح کے سوالات کیے۔ لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

فضیلت سورۂ اخلاص

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ [1]

مفسرین نے اس ارشاد کی مختلف توجیہات کی ہیں مگر سیدھی اور صاف توجیہ یہ ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد توحید و رسالت اور آخرت پر ہے، یہ سورت چونکہ خالص توحید بیان کرتی ہے اسی لیے نبی ﷺ نے اسے ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔ یہ سورہ اگرچہ قرآن حکیم کی ایک مختصر سورہ ہے مگر علوم و معارف کا گنجینہ ہے۔ اس کے ہر ہر لفظ کی گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو ہر طرف اسرار و معانی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طرف یہ سورہ دین اسلام کی روح و مغز یعنی توحید کا محکم انداز میں اثبات کرتی ہے تو دوسری طرف دنیا کے تمام عقائد باطلہ اور فرق ضالہ کا رد سلجھے ہوئے انداز میں کرتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ایک چھوٹا سا لشکر کہیں بھیجا جب وہ پلٹے تو انھوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ آپ نے جس شخص کو ہمارا کمانڈر اور سردار بنایا تھا وہ ہر نماز کی قراءت کے خاتمہ پر ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ (سورہ اخلاص) پڑھا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ: ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے، پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ یہ رحمٰن کی صفت ہے۔ مجھے اس کا

[1] بخاری، فضائل القرآن، فضل قل هو الله احد، رقم: ۵۰۱۵۔ مسلم، رقم: ۸۱۲۔ ترمذی، رقم: ۲۹۰۰۔ ابوداؤد، رقم: ۱٤٦١.

پڑھنا بہت پسند ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: انہیں خبر کردو کہ اللہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے۔ ❶

ایک اور روایت اسی قسم کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک انصاری مسجد قبا کے امام تھے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ الحمد للہ ختم کرنے کے بعد سورہ اخلاص کو پڑھتے، اس کے بعد پھر جونسی سورت پڑھنی ہوتی وہ پڑھتے تھے۔ مقتدیوں نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: میں اسی طرح کرتا رہوں گا، چاہے مجھے امام رکھو یا نہ رکھو۔ لوگوں نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ سے بیان کیا تو آپ ﷺ نے امام سے کہا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہنے لگے: اللہ کے رسول! مجھے اس سورہ سے بڑی محبت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی محبت تمہیں جنت میں پہنچا دے گی۔ ❷

سورۃ الاخلاص کا ایک غیر مسلم پر اثر

اس سورۂ کریمہ کی معجزنمائی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسی ایک سورہ نے ایک جرمن مفکر مسٹر رابرٹ برنٹ کے دل کی دنیا بدل دی اور انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے اسلام قبول کرلیا اپنے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں جو تفصیلات مسٹر رابرٹ برنٹ نے بیان کی وہ یہ ہیں:

میں ایک جرمن نومسلم ہوں جب میری عمر دس سال کی ہوئی تو جرمن پروٹسٹنٹ فرقے کی روایات کے مطابق مجھے کلیسا میں داخل کردیا گیا۔ پادری نے جب مجھے مقدس تثلیث کا مطلب سمجھایا تو میں حیران رہ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ خدا، اس کا بیٹا حضرت عیسیٰ اور روح القدس بظاہر علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دراصل یہ ایک ہی چیز کی تین صورتیں ہیں۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اتری کیونکہ علم ہندسہ کا معمولی طالب علم بھی یہ بات سمجھتا ہے کہ ایک ایک ہے اور تین تین، آپ ہزار کوشش کریں مگر ایک کو تین اور تین کو ایک ثابت نہیں کرسکتے۔ دل نے وہیں کہہ دیا کہ یہ عقیدہ الہامی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ من گھڑت عقیدہ ہے۔ پھر پادری نے ایک دن یہ بتایا کہ عیسیٰ کو سولی پر لٹکا دیا گیا اور یہ قربانی انھوں نے اس لیے دی تھی

❶ بخاری، التوحید، ما جاء فی دعاء النبی……، رقم: ۷۳۷۵.

❷ بخاری، الصلاۃ، الجمع بین السورتین فی رکعۃ……، رقم: ۷۷٤۔ ترمذی، رقم: ۲۹۰۱.

تا کہ ان کے پیروؤں کے اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہوجائے، یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ میں ایسے خدا کا تصور نہیں کرسکتا تھا جس نے عیسائیوں کی نجات کا ایسا سستا اور عجیب وغریب راستہ بتایا ہو کہ ایک پیغمبر کے سولی پر چڑھ جانے سے اس کی پوری امت کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے اور پوری امت کو ہر قسم کے گناہ کرنے کی کامل آزادی مل جائے۔ پھر یہ بات تو کسی طرح بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اللہ بزرگ و برتر ہوتے ہوئے اپنی مخلوق ہی میں سے کسی کو اپنا بیٹا بنالے بلکہ اسے دنیاوی جھگڑوں سے بلند ہونا چاہیے۔ انہی اسباب کی بنا پر میرا دل کلیسا اور پادریوں کی تعلیم سے متنفر ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے حقیقت کی تلاش کی غرض سے توریت کا مطالعہ شروع کیا اسے ختم کرنے کے بعد بدھ مت پر لکھی گئی ہر دستیاب کتاب پڑھ ڈالی۔ اسلامی کتابوں کا مطالعہ میں نے اس لیے نہیں کیا کیونکہ اسلام کے خلاف پادریوں کی زہر افشانی کی وجہ سے میں بچپن ہی سے اس مذہب کو قابل اعتناء نہیں سمجھتا تھا۔ میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ میں کائنات کے خالق اور تخلیقِ کائنات کی حقیقت سمجھ لوں۔ میں یہ معلوم کرلوں کہ زمین پر انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میں تلاش حق میں کتابوں کا کیڑا بن گیا۔ بڑے بڑے مصنّفین ومفکرین کی کتابیں پڑھتا رہا اس حالت میں پورے چودہ سال گزر گئے اور تلاش حق اور تلاش حقیقت کی دھن آگ کی طرح میرے سینے میں سلگتی رہی۔

عجیب بات ہے کہ جب میں نے حوصلہ چھوڑ دیا اور فیصلہ کرلیا کہ میں خواہ لاکھ کوشش کروں مجھے حقیقت کا سراغ نہیں مل سکتا۔ اسی وقت اللہ نے مجھ پر اپنا خاص فضل وکرم کیا، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کو میرے تھک ہار کر بیٹھ جانے پر ترس آ گیا، اس نے صراط مستقیم کی طرف میری رہنمائی، اس طرح کی اتفاق سے ایک ایسے جرمن جہاز راں سے میری ملاقات ہوگئی جسے مشرق کے تمام ممالک دیکھنے کا موقع ملا تھا اور لطف کی بات یہ کہ وہ خود بھی مسلمان نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک عیسائی تھا۔ مگر مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے عقائد اور ان کے طرز تمدن سے متاثر تھا، اسلام کے بارے میں اپنی معلومات کا سکہ میرے اوپر بٹھانے کے

لیے اس نے سورۂ اخلاص کا متن اور ترجمہ مجھے دکھایا، جب میں نے اس ترجمہ کو پڑھا تو دنگ رہ گیا، وہی چیز جو میں ساری عمر تلاش کرتا رہا تھا قرآن کی اس چھوٹی سی سورہ میں موجود تھی۔ چودہ سال سے جس راہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا وہ مل گئی۔ پھر میں نے اسلام کا کافی مطالعہ کیا۔ اس کے بعد قاہرہ چلا گیا۔ تاکہ وہاں مسلمانوں کے درمیان رہ کر اسلام کا مطالعہ کروں جب میں جامعہ ازہر سے نکلا تو دوسرا انسان تھا۔ اب تبلیغ اسلام میری زندگی کا مقصد اولین ہے۔

اخلاص کی اہمیت

جس طرح سے ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی انتہا محبتِ الٰہی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۱۶۵)

''اور جو مومن ہیں اللہ سے ان کی قوی محبت ہے۔''

تمام انبیاء کی تعلیم کا لب لباب یہی تھا اور جس طرح ایمان کی غایت محبت الٰہی ہے۔ اسی طرح محبت کی جان اخلاص ہے۔ تمام طاعات وعبادات بغیر اخلاص عند اللہ نامعتبر ہیں۔ حتیٰ کہ ایمان وعقیدہ میں اگر اخلاص نہ ہوتو نفاق بن جاتا ہے اور عمل میں اگر اخلاص نہ ہوتو ریا بن جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

اخلاص سے ناآشنا ہر چیز ہے فتنہ
للہ نہ کی جائے تو تکفیر ہے فتنہ

عقیدے میں اخلاص

متولی الشعراوی اپنی مشہور کتاب ''عقیدۃ المسلم'' میں لکھتے ہیں:

"الاخلاص انه كانت هناك امور مشتبكة، وانت تخلص بعضها من بعض"

''یعنی بہت سی چیزیں آپس میں الجھی ہوئی ہیں اور آپ ان میں سے بعض چیزوں کو نکال کر الگ کرلیں۔ آپ کے اس الگ کرنے کے عمل کو اخلاص کہیں گے۔''

اخلاص کے اس مفہوم کی روشنی میں دیکھئے کہ لوگوں نے اپنی جہالت اور کج فکری کی وجہ سے حقیقی الٰہ واحد کے علاوہ اور بہت سے باطل الٰہ گھڑ لیے جس سے الوہیت کے مسئلے میں اشتراک ہوگیا۔ اب اگر حقیقی الٰہ کو باطل الٰہ سے الگ کرلیا جائے تو اس کو اخلاص فی العقیدۃ کہیں گے۔

عمل میں حقیقی اخلاص

معلوم ہونا چاہیے کہ چیزوں میں ملاوٹ کا شائبہ ہوسکتا ہے، جب کوئی چیز ملاوٹ سے پاک وصاف ہوتو کہتے ہیں خالص ہے اور اس فعل کو اخلاص کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ ﴾ (النحل: ١٦/ ٦٦)

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں غور درکار ہے۔ ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے ان کے درمیان میں سے خالص اور خوشگوار دودھ ہم تمہیں پینے کے لیے دیتے ہیں۔''

اسی طرح جب عمل ریا سے خالص ہوجائے تو اللہ کے لیے ہوجاتا ہے۔ ابوعبد اللہ الباجی الزاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عمل کے پورا ہونے کے لیے پانچ خصلتوں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) اللہ کی معرفت (۲) معرفتِ حق (۳) عمل میں اخلاص (۴) عمل سنت کے مطابق کرنا۔ (۵) حلال روزی کھانا۔

ان میں سے ایک بھی کم ہوجائے تو عمل پورا نہیں ہوگا۔ مثلاً آپ نے اللہ کی معرفت حاصل کرلی۔ مگر حق کی معرفت حاصل نہیں کی۔ اس سے بھی آپ کو نفع نہیں پہنچ سکتا اور اگر آپ نے حق کی معرفت حاصل کرلی مگر اللہ کی معرفت حاصل نہیں کی۔ اس سے آپ کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا اور اگر آپ نے اللہ کی معرفت حاصل کرلی اور حق کی بھی معرفت حاصل کرلی مگر عمل میں اخلاص پیدا نہیں کیا تو اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اور اگر آپ نے معرفتِ خداوندی اور معرفت حق کے ساتھ ساتھ عمل میں اخلاص بھی پیدا کرلیا۔ لیکن عمل سنت کے مطابق نہیں کیا

تو اس عمل سے بھی کوئی فائدہ نہیں اور اگر چاروں مذکورہ باتیں آپ نے پوری کرلیں مگر آپ نے حلال روزی نہیں کھائی تو اس سے بھی آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

فضیل رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك : ٦٧/ ٢) میں احسن عملا کی تفسیر اَخْلَصُ عَمَلًا وَاَصْوَبُ عَمَلًا سے کی ہے یعنی عمل کی صحت اور اس کے مقبول عند اللہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالص کے ساتھ ساتھ صواب بھی ہو۔ فرماتے ہیں: خالص وہ ہے جو فقط اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہو اور صواب وہ ہے جو سنت کے مطابق ہو۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! بھلا بتایئے کہ ایک آدمی مال اور شہرت کی خاطر لڑنے گیا تو اس کے لیے کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کچھ نہیں، اس نے تین مرتبہ پوچھا ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا: ''کچھ نہیں'' پھر فرمایا کہ اللہ صرف اسی عمل کو شرف قبولیت سے نوازتا ہے جو اسی کے لیے خالص ہو اور اس عمل سے اس کی رضا جوئی مقصود ہو۔ [1]

یہ حقیقت تو اب روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ دین میں اخلاص کس قدر ضروری ہے یہاں کسی باطل کی ذرا بھی آمیزش سم قاتل سے زیادہ خطرناک ہے، اب اس خاص مسئلہ محبت الٰہی کو دیکھیں اس میں سب سے زیادہ اخلاص کی ضرورت ہے۔ محبت الٰہی میں اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی محبت کے علاوہ بہت سی دوسری چیزوں کی محبت دل میں ہونا قدرتی بات ہے۔ مثلاً والدین، بیوی بچے، اعزہ واقارب، مال و دولت، جاہ وحشمت سب چیزوں سے انسان محبت کرتا ہے۔ لیکن جو چیز مطلوب ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام چیزوں کی محبت اللہ کی محبت پر غالب نہ آنے پائے کہ اللہ کی فرماں برداری اور اطاعت کے راستے میں رکاوٹ بن جائے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

---

[1] نسائی، کتاب الجهاد، باب من غزا یلتمس الاجر والذکر، رقم: ٣١٤٢۔ یہ روایت عکرمہ بن عمار مدلس راوی نے عنعن سے بیان کی ہے۔

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۲۰۰)

''تم اللہ کو اس طرح یاد کرو جیسے اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یاد کرو۔''

دیکھیے اس آیت میں محبت الٰہی کو ادا کرنا تھا تو یہ نہیں کہا کہ تم اپنے باپوں کو یاد نہ کرو۔ یہاں اللہ نے اپنی محبت اور باپ کی محبت کو باہم مشبہ اور مشبہ بہ قرار دیا، اس سے ظاہر یہ ہوا کہ باپوں سے بھی محبت رکھو مگر اللہ کے مقابلہ میں اس محبت کو بالکل کم تر اور ہیچ سمجھو۔

قل کا مفہوم

قُلْ کے معنی ہیں ''کہہ دیں'' یہ قَالَ یَقُولُ سے امر ہے جس کے معنی ہیں ''کہنا'' مگر اس کا وہی مطلب ہے جو ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ﴾ میں ہے یعنی اعلان کردو۔ منادی کردو۔ برملا کہہ دو کیونکہ سورۂ کافرون کا مضمون اعلان ہی کا تقاضا کر رہا تھا۔ تاکہ مفسدین اور ائمہ کفر جو کفر اور اسلام کے درمیان سمجھوتے کے خبط میں مبتلا تھے وہ اپنی سعیٔ نامراد سے مایوس ہوجائیں اور سیدھے سادے قسم کے لوگ جو اس طرح کے سمجھوتے کو امن پسندی سمجھ رہے تھے انہیں معلوم ہوجائے کہ یہ امن پسندی اور صلح و آشتی کا راستہ نہیں بلکہ فساد اور کجی کی مستقل نشوونما کا راستہ ہے۔ اس طرح کے اعلان کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب مباحثے اور مناظرے کا پورا دور گزر چکا ہوتا ہے اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سمجھانے کا حق ادا ہوچکا ہے۔ اب جو لوگ مزید بحثیں اٹھا رہے ہیں وہ سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ بات کو الجھانے اور طول دینے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ اس طرح کے موقع پر مناسب یہ ہوتا ہے کہ بات دوٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اس طرح کہہ دی جائے کہ مخاطب اندازہ کرلے کہ متکلم کو جو کچھ کہنا تھا اس نے کہہ دیا۔ اب وہ اپنا وقت مزید ضائع کرنے کے لیے نہ تیار ہے اور نہ اس کے مؤقف میں ذرہ برابر کسی تبدیلی اور لچک کی گنجائش ہے۔ [1]

---

[1] دیکھیے: تدبر القرآن: ۹/ ۶۴۸۔

هُوَ کا مطلب

هُوَ کا معنی ہے ''وہ'' یہ ضمیر شان ہے جس کا مرجع متعین ہوتا ہے۔ جب مطلقاً هُوَ بولا جائے گا تو اس سے وہی مراد ہوگا، جس کی شان ہر چیز سے ہویدا ہے۔ وہ: کون وہ؟ ارے وہی جس کا پتہ کائنات کی ہر شے کو معلوم ہے۔ دریاؤں کی روانی سے پوچھ لو۔ سمندروں کی طغیانی سے پوچھ لو۔ آسمانوں کی بلندی سے پوچھ لو یا زمین کی پستی سے پوچھ لو، پہاڑوں کے جلال سے پوچھ لو۔ درختوں کے جمال سے پوچھ لو۔ دن کی روشنی سے پوچھ لو، رات کی تاریکی سے پوچھ لو۔ سورج کی کرنوں سے پوچھ لو۔ کواکب کی چشمک سے پوچھ لو۔ عصافیر کی چہک سے پوچھ لو۔ سبزے کی لہک سے پوچھ لو، کلیوں کی چٹک سے پوچھ لو۔ پھولوں کی مہک سے پوچھ لو۔ ابر کی دھمک سے پوچھ لو۔ زندگی کی ہمک سے پوچھ لو۔ لہروں کی لچک سے پوچھ لو۔ غنچوں کے تبسم سے پوچھ لو۔ عنادل کے معصوم شور سے پوچھ لو۔ کرنوں کی جگمگاہٹ سے پوچھ لو۔ حسین صبح کی انگڑائیوں سے پوچھ لو۔ پتوں کی سرسراہٹ سے پوچھ لو۔ گلشن وخیاباں سے پوچھ لو۔ کہسار و بیابان سے پوچھ لو۔ صحرا کے سناٹے سے پوچھ لو آبادی کے ہنگامے سے پوچھ لو۔

كل الى ذاك الجمال يشير

''ہر چیز اس جمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ﴾

(بنی اسراء یل : ۱۷/ ٤٤)

''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔''

لفظ هُوَ سے اس سورہ میں منکر وجود باری کا ابطال کیا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ ذات پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ ہستی جسے قرآن اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ فی الحقیقت موجود ہے، اس کا وجود مستقل اور حقیقی ہے، وہمی یا خیالی نہیں ہے۔

متولی الشعرانی نے اپنی کتاب ''عقیدۃ المسلم'' میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن نے اللہ کے وجود پر دلیل نہیں پیش کی ہے کیونکہ دلیل کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں مسئلہ نظری ہو۔ لیکن اللہ کے وجود کا معاملہ بدیہی فطری اور وجدانی ہے، فلاسفہ اور مفکرین جنھوں نے اللہ کے وجود پر دلیلیں وضع کی ہیں انھوں نے تعقل اور تصور کو خلط ملط کر دیا۔ انھوں نے تعقل کو تصور بنا دیا اور تصور کو تعقل بنا دیا۔ [1]

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اللہ جل جلالہ

یوں تو اللہ تعالیٰ کے بہت سارے نام ہیں۔ لیکن ان میں لفظ جلالہ اللہ اسم ذات ہے اور باقی اسماء صفات ہیں۔ یہ نام اس وقت بھی تھا جب کائنات میں کچھ نہ تھا اور اس وقت بھی ہوگا جب کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ نام کائنات کی روح اور جان ہے، یہ دنیا اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کسی ایک زبان پر بھی یہ مقدس نام جاری رہے گا اور اگر کوئی ایک زبان بھی ''اللہ'' ''اللہ'' کہنے والی باقی نہ رہی [2] تو بساطِ عالم کو لپیٹ دیا جائے گا، آسمان کی قندیلیں

---

[1] تعقل یہ ہے کہ عقل حکم لگائے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی قوت ہے۔ مثلاً چند آدمی ایک کمرے میں بیٹھے ہیں اور دروازہ بند ہے۔ اچانک دروازہ کی گھنٹی بجائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کمرے کے تمام آدمی دروازے کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور کسی کو یہ انکار کرنے کی مجال نہیں کہ دروازے پر کوئی موجود نہیں بلکہ سب کو یقین ہے کہ دروازے پر کوئی موجود ہے یہ تعقل ہے۔ اب ان میں یہ بات ہونے لگتی ہے کہ دروازے پر کون ہے؟ کوئی کہتا ہے مرد ہے۔ کوئی کہتا ہے عورت۔ کوئی کہتا ہے چھوٹا ہے۔ کوئی کہتا ہے بڑا ہے۔ کوئی کہتا ہے گندم گوں ہے تو کوئی کہتا ہے کالا ہے کوئی کہتا ہے گورا ہے۔ کوئی کہتا ہے بشیر ہے کوئی کہتا ہے نذیر ہے۔ یہ اختلاف ظاہر ہے کہ تصور میں ہے نہ کہ تعقل میں۔ (جلال الدین القاسمی)

[2] دیکھیے: مسلم، الایمان، ذهاب الایمان اٰخر الزمان، رقم: ١٤٨.

اس سے مراد اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اس کی وحدانیت کو تسلیم کرنا ہے نہ کہ مفرد ذکر اللہ اللہ پکارنا یہ ذکر نبی کریم ﷺ اور صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں۔ (شہباز حسن)

بجھادی جائیں گی، زندگی کے دل لبھانے والے سارے نظارے ختم کردیے جائیں گے۔ یہ نام ایسا مبارک اور بامعنی ہے کہ اگر اس میں سے کوئی حرف گرا بھی دیا جائے تو بھی اس کا معنوی حسن برقرار رہتا ہے۔ مثلاً شروع سے الف گرادیا جائے تو للہ رہ جائے گا۔ یعنی اللہ کے لیے۔ قرآن میں ہے:

﴿ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ (البقرة : ۲/ ۲۸٤)

اور اگر لام گرادیں تو ''الٰہ'' رہ جائے گا قرآن میں ہے:

﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ (البقرة : ۲/ ۱٦۳)

اور اگر الف لام دونوں کو حذف کردیں تو لَہٗ رہ جائے گا جس کا معنی ہے ''اس کے لیے'' اور اگر لام کو بھی حذف کردیں تو ''ہٗ'' ''وہ'' رہ جائے گا جس کا متعین مرجع اللہ کی ذات کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟

پورے قرآن میں اسم جلالت اللہ تقریباً دو ہزار نو سو چالیس مرتبہ آیا ہے، نزول قرآن سے قبل عربی زبان میں خالق کائنات کے لیے جو لفظ مستعمل تھا وہ اللہ تھا جسے لفظ الٰہ پر تعریف کا الف لام داخل کرکے ''اللہ'' اسم علم بنالیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے مشہور رسالہ ''العبودیة'' میں الٰہ کا مفہوم یہ بتایا ہے:

''الٰہ وہ ہے جس کی طرف دل کا میلان کمال محبت اور نہایت تعظیم و احترام و اکرام، خوف درجا اور اس طرح کی دیگر کیفیات کے ساتھ ہو۔''

لسان العرب (ج۷اص۲۶۰) میں ہے:

''وَلَا يَكُوْنُ اِلٰهٌ حتى يكون معبوداً او حتى يكون لعابده خالقا ورازقا ومدبرا وعليه مقتدرا فمن لم يكن كذالك فليس باله وان عبد ظلما بل هو مخلوق ومتعبد''

''کسی ہستی کو صرف اس وقت الٰہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معبود اور معبود ہونے کے

لیے ضروری ہے کہ وہ عابد کا خالق ہو۔ رازق و مدبر ہو اور ساتھ ہی اس پر تصرف کا اختیار بھی رکھتا ہو جو ایسا نہ ہو وہ الٰہ کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا خواہ وہ ظلم و جبر سے پوجا ہی جائے۔ وہ ہر حال میں مخلوق و مطیع ہوگا۔''

لسان العرب کے اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ الٰہ ہی معبود ہوسکتا ہے۔ لفظ معبود عبادت سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے کسی کے سامنے اپنے اختیار سے انتہا درجہ کی عاجزی و انکساری سے پیش آنا اور یہ حالت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس ہستی کی انتہا درجہ کی عظمت و جلالت اور تقدس کا قائل نہ ہوا جائے۔ عابد کو دو ہی چیزیں عبادت پر مجبور کرتی ہیں: (۱) کمال عظمت (۲) کمال محبت۔

اب یہ امر وضاحت طلب ہے کہ کمال عظمت و محبت کس چیز سے پیدا ہوتی ہے؟ تو واضح رہے کہ یہ عقیدہ دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔

① علم کامل مافوق الاسباب

② قدرت کامل مافوق الاسباب۔

ہمارا علم ماتحت الاسباب ہے۔ کیونکہ ہمارا علم سننے کا، چھونے کا، چکھنے، سونگھنے کا محتاج ہے اس لیے علم ناقص ہے کامل نہیں۔ اسی طرح ہماری قدرت بھی ماتحت الاسباب ہے۔ مثلاً اگر ہاتھ نہ ہوں تو کام نہیں کرسکتے۔ دماغ درست نہ ہو تو کام درست نہیں کرسکتے، پاؤں نہ ہوں تو چل پھر نہیں سکتے۔

مگر اللہ کا علم کامل مافوق الاسباب اور اس کی قدرت کامل مافوق الاسباب ہے۔ جب بندہ اللہ کو پکارتا ہے تو اس کے اعتقاد میں یہ ہوتا ہے کہ میں جس ذات کو پکار رہا ہوں اسے میرے دکھ درد کا علم ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ مجھے فلاں جگہ سے فلاں بندہ پکار رہا ہے یہ علم کامل ہے۔

دوسری چیز بندہ کے اعتقاد میں یہ ہوتی ہے کہ میں جس ذات کو پکار رہا ہوں اسے

قدرت و طاقت ہے کہ بغیر کسی سبب کے میری مشکلات آسان کردے۔ جس وقت اور جہاں سے پکاروں ہر وقت ہر جگہ مدد کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی انسان کے متعلق یہ دو عقیدے کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اگر کوئی اپنے والد کو جو دوسرے شہر میں ہے۔ یہاں ہندوستان میں بیٹھ کر چلا چلا کر اپنی پریشانی میں پکارے تو لوگ یہی کہیں گے کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اسی طرح تکلیف میں بظاہر شفا دینے پر ڈاکٹر کو بھی قدرت ہے۔ لیکن آج تک ڈاکٹر کو کسی نے خدا نہیں سمجھا، اس کا کام ہے انجکشن لگانا اور دوا دینا آگے شفا دینا اللہ کا کام ہے۔ یہ بڑا عجیب وغریب نکتہ ہے کہ قرآن میں جہاں بھی الٰہ کا ذکر آیا ہے وہاں دو چیزیں (۱) علم کامل (۲) قدرت کامل ضرور ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۶۲ ؕ﴾ (النمل : ۲۷/ ۶۲)

’’بھلا کون ہے جو بے قرار کی پکار سنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے جب وہ بے قرار اسے پکارتا ہے اور کون ہے جو تمہیں زمین میں تصرف کا حقدار بناتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ تم لوگ بہت کم غور کرتے ہو۔‘‘

اس آیت میں وہی دو صفات ہیں، مضطر کی پکار سننا علم کامل اور اس کی پکار سن کر دکھ دور کرنا قدرت کامل، پھر اس کے ساتھ ہی کہا گیا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ ہے جو ایسا کر سکے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۱ ؕ﴾

(النمل : ۲۷/ ۶۱)

’’بھلا کس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس زمین کے درمیان ندیاں بنائیں اور زمین کے لیے بھاری بھاری پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان روک اور

آڑ بنادی۔ کیا اللہ کے سوا اور الٰہ ہے؟ بلکہ ان میں سے اکثر اس بات کو جانتے ہی نہیں۔''

یہاں زمین کو قرار گاہ بنانا، اس میں نہریں چلانا، پھر دریاؤں اور سمندروں میں کرشمے دیکھیں کہ ایک ہی دریا ہے مگر ایک طرف میٹھا پانی بہتا ہے اور دوسری طرف کڑوا۔ لیکن اللہ نے دونوں کے درمیان ایک غیر مرئی آڑ رکھی ہے جو دو پانیوں کو آپس میں ملنے نہیں دیتی۔ بنگلا دیش میں ایک دریا ہے ایک طرف میٹھا پانی، دوسری طرف کڑوا ہے۔ لیکن آپس میں ملتے نہیں۔ دریائے چناب کا پانی مٹیالے رنگ کا ہے اور دریائے سندھ کا پانی صاف وشفاف ہے ملنے کے باوجود دونوں دریاؤں کا پانی جدا جدا نظر آتا ہے۔ سمندر میں دیکھیں عدن کے قریب ایک طرف ٹھنڈا پانی ہے دوسری طرف گرم پانی ہے۔ یہ قدرت کامل ہے۔ یہاں بھی آخر میں یہی کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ہے جو ایسا کر سکے!

اسماء وصفات

اللہ کی صفات کو ہم اسماء بھی کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ صفت اسم کب بن جاتی ہے تو جاننا چاہیے کہ جب صفت کمال کی اس انتہا کو پہنچ جائے کہ صفت بولے جانے پر اللہ ہی متبادر الی الذہن ہو تو اس وقت صفت اسم بن جاتی ہے۔ اللہ کی صفات کی دو قسمیں ہیں۔

❶ صفت ذات ❷ صفت فعل۔

صفت ذات وہ ہے جس کا مقابل نہ پایا جاتا ہو۔ مثلاً آپ کہیں "اَللّٰہُ حَیٌّ" ''اللہ زندہ ہے'' تو حی یہ صفت ذات ہے جس کا مقابل نہیں پایا جاتا جو میّت ہے اور محی صفت فعل ہے کیونکہ اس کا مقابل ممیت پایا جاتا ہے۔ اسی طرح عزیز صفت ذات ہے معز صفت فعل ہے کیونکہ اس کا مقابل مذل پایا جاتا ہے۔

احد اور واحد میں فرق

کلمہ احد کو جب ہم دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ واحد کے معنی میں نہیں ہے۔ کیونکہ

ایک چیز کبھی واحد ہوتے ہوئے بھی مرکب ہوتی ہے اور چیز جب مرکب ہو تو اجزاء کی محتاج ہوتی ہے، واحد سے اس بات کی نفی تو ہو جاتی ہے کہ اس کے مثل کوئی واحد ہو، لیکن اس سے اس کے فی ذاتہٖ مرکب ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے مناطقہ کی ایک اصطلاح کل اور کلی، جز اور جزئی سمجھ لیں۔ کل، جز کے مقابلے میں ہوتا ہے اور کلی جزئی کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ کلی وہ جنس ہے جو ایسی کثیر چیزوں پر بولی جائے جن کی حقیقتیں ایک ہوں مثلاً لفظ انسان کلی ہے، یہ زاہد، راشد، خالد، حامد سب پر بولا جاتا ہے اور سب کی حقیقتیں ایک ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کیسے سمجھیں کہ سب کی حقیقتیں ایک ہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم زاہد، راشد، خالد وغیرہ میں کسی کو موضوع بتائیں اور لفظ انسان کو اس کا محمول بنادیں اور دیکھیں کہ قضیہ صحیح ہے یا نہیں۔ مثلاً ہم یہ کہیں زاہد انسان، راشد انسان، خالد انسان۔ ظاہر ہے کہ سارے قضیے صحیح ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ ان سب کی حقیقتیں ایک ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کلی اپنی جزئیات میں سے ہر ہر جزئی کا جز ہوتی ہے مگر کل کا معاملہ ایسا نہیں ہے کیونکہ کل کا اطلاق کثیرین پر تو ہوگا مگر اس کے افراد کی حقیقتیں جدا جدا ہوں گی مثلاً کرسی جو بہت سی چیزوں مثلاً لکڑی، کیلوں، چمڑوں وغیرہ سے مل کر بنتی ہے اور کیل لکڑی چمڑا سب کی حقیقتیں الگ الگ ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیل کرسی ہے، لکڑی کرسی ہے اور چمڑا کرسی ہے۔ اس بحث سے ایک عجیب منطقی اصول معلوم ہوا کہ کلی جز ہے اور جزئی کل ہے۔ **فافھم و تدبر**

اتنا سمجھنے کے بعد اب لفظ واحد کو دیکھئے کہ یہ کلی ہے یا کل ہے تو جواب یہ ہے کہ واحد کل ہے اور کلمہ احد کلمہ واحد کا غیر ہے یعنی کلمہ احد کل نہیں ہے۔

احد اور واحد کے فرق کی مزید تفصیل

اگرچہ قرآن حکیم نے توحید الٰہی کو لفظ واحد سے بھی بیان کیا ہے۔ مثلاً ﴿وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (الرعد: ۱۳/ ۱۶) ''اور وہی نہایت زبردست ہے۔''

لیکن یہاں اس کی ان یکتائی کا اظہار مقصود ہے یعنی وہ ایسا واحد ہے کہ اس میں کثرت

کا کوئی شائبہ نہیں۔ نہ جنسی نہ نوعی نہ مقداری نہ عددی نہ اعتباری، اس لیے یہاں واحد کے بجائے احد کا لفظ استعمال کیا گیا۔ کیونکہ انسان کے دماغ میں واحد سے پہلے نصف (آدھا) اور واحد کے بعد اثنین (دو) کا تصور آ سکتا ہے لیکن احد کا لفظ ان دونوں تصورات کی نفی کر دیتا ہے۔ یعنی اللہ ایسا ''ایک'' ہے کہ اس کی نظیر یا مثال کائنات میں کہیں موجود نہیں۔ یعنی لفظ احد میں وحدت ذاتی اور شان یکتائی دونوں تصورات مضمر ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں اس فرق کو مثال سے یوں واضح کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان لا یقوم له واحد۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلاں آدمی کے لیے ایک شخص نہیں کھڑا ہو رہا ہے بقیہ سب کھڑے ہو گئے۔

اور فلان لا یقوم له احد اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلاں آدمی کے لیے کوئی نہیں کھڑا ہو رہا ہے۔

اہل لغت نے احد اور واحد میں یہ فرق بتایا ہے کہ ''احد'' وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو اور واحد وہ ہے جس کی صفات میں اس کا کوئی شریک نہ ہو غالباً اسی وجہ سے لفظ احد اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے لیے بطور صفت نہیں آیا ہے اس سے یکتائی اور بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔

لفظ احد سے ثنویت کا رد

علامہ شہرستانی نے "الملل والنحل" کے حاشیے پر لکھا ہے کہ مجوسی حنفی کے بالمقابل ہیں۔ یہ ثنویت کے علم بردار تھے یعنی ان کا خیال تھا کہ خالق دو ہیں۔ نور کا خالق، اور ظلمت کا خالق، اور یہی عالم میں خیر و شر اور نفع و ضرر اصلاح و فساد کے ذمہ دار ہیں۔ فارسی میں انہیں یزداں (خالق خیر) اور اہرمن (خالق شر) کہتے ہیں۔ لفظ احد سے ثنویت کے باطل نظریے کی تردید ہو گئی کیونکہ احد ایسے واحد کو کہتے ہیں جس میں کثرت کا کوئی شائبہ نہ ہو یعنی مطلب یہ ہوا:

1. وہ ہمیشہ سے ہے اس وقت بھی تھا جب کچھ نہ تھا۔
2. اس سے پہلے نہ کوئی خدا تھا نہ اس کے بعد ہوگا۔
3. وہ ہمیشہ سے ہے اس کے سوا جو کچھ ہیں سب اسی کی مخلوق ہیں۔
4. خداؤں کی کوئی جنس نہیں جس کا وہ فرد ہو۔

قرآن میں ہے:

﴿وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝﴾ (النحل: ١٦/ ٥١)

''اور اللہ نے فرمایا: دو معبود نہ بناؤ، بے شک وہ تنہا معبود ہے، پس تم لوگ مجھی سے ڈرا کرو۔''

تعدد فی الالوہیت (یعنی الٰہ کئی ہیں) کی نفی پر ابن تیمیہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ﴾ (المؤمنون: ٢٣/ ٩١)

''اللہ نے کسی کو اولاد قرار نہیں دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو تقسیم کر کے جدا کر لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔''

آیت مذکورہ میں پہلے اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ کا کوئی بیٹا ہو جس کی عبادت کر کے اللہ کا تقرب حاصل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی نفی ہوگئی کہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی الٰہ واسطہ ہے، دوسرے اس بات کی بھی اس آیت کریمہ سے نفی ہوگئی کہ معبود متعدد ہوں کیونکہ اگر الٰہ واحد کے ساتھ کسی اور کو بھی مستحق عبادت تسلیم کر لیا جائے تو یہ امر دو حال سے خالی نہیں:

1. ہر الٰہ قادر ہوگا تو لازم آئے گا کہ ہر خدا اپنی مخلوق کو جدا کر لیتا۔
2. ایک الٰہ قادر ہو دوسرا نہ ہو تو یہ ماننا لازم آئے گا کہ ہر معبود دوسرے پر چڑھائی کر لیتا

اور یہ معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

ثابت یہ ہوا کہ قادر صرف ایک الٰہ ہوگا اور وہی مستحق عبادت ہوگا۔

آیت مذکورہ میں دو لازم ہیں اور مشاہدہ دونوں لازموں کی نفی کرتا ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کی نفی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک الٰہ کے علاوہ کوئی اور الٰہ نہیں ہوسکتا جس کی عبادت کی جائے۔

دوسری دلیل:......

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ؕ﴾

(سبا: ٣٤/ ٢٢-٢٣)

''کہہ دیجیے کہ جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا کچھ سمجھ بیٹھے ہو وہ ذرہ بھر کے مالک نہیں آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کچھ حصہ ہے اور نہ اللہ کا ان میں سے کوئی مددگار ہے اور اس کی شفاعت کام نہ دے گی مگر جس کے لیے وہ اذن فرمائے۔''

اس آیت میں مشرکین سے سوال کیا گیا ہے کہ اللہ کے علاوہ جن کی تم عبادت کرتے ہو یہ مستقل طور پر یا شرکت کے طور پر زمین اور آسمان میں ذرہ برابر مالکانہ حق رکھتے ہیں؟ اور یا ان میں سے کسی نے زمین اور آسمان کی تخلیق میں امداد کی ہے؟ مشرکین اس سوال کے جواب میں خاموش ہیں اور ان کا یہ سکوت اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ زمین اور آسمان میں ذرہ برابر مالکانہ حق نہیں رکھتے اور انھوں نے تخلیق میں معاونت بھی نہیں کی ہے۔ پھر قرآن ایک دوسرے قضیے کی نفی کے لیے آگے بڑھتا ہے اور مشرکین سے کہتا ہے کہ اس کے حضور شفاعت وہی کرسکتا ہے جسے وہ شفاعت کی اجازت دے، جس سے مشرکین کا

یہ دعویٰ باطل ہوتا ہے کہ

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ﴾ (الزمر: ۳۹/ ۳)

''(وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔''

پس معلوم ہوا کہ وہ جو نہ مستقل طور پر نہ شرکت کے طور پر تخلیق کر سکے وہ مستحق عبادت نہیں ہوسکتا۔

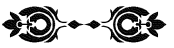

تفسیر الصمد

﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾

''اللہ بے نیاز ہے۔''

سدی سے مروی ہے کہ صمد کا اطلاق اس پر ہوتا ہے کہ جس کی طرف آرزوئیں لے کر جائیں اور مصیبتوں کے وقت اس سے فریاد کریں۔ سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ صمد وہ ہے جو اپنے سارے افعال وصفات میں کامل ہو۔ مقاتل بن سلیمان سے مروی ہے کہ صمد وہ ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ زجاج کا قول ہے کہ صمد وہ ہے جس پر سیادت ختم ہو جاتی ہو۔ [1]

ہر چیز کا صمود اس کی طرف ہو۔ یعنی ہر چیز اس کا قصد کرے۔ اسی طرح جب لوگ کسی گھر کی طرف بوقت حاجات جانے کا ارادہ کریں تو وہ گھر بیت مصمود یا بیت مصمد کہا جاتا ہے۔ طرفہ کا شعر ہے۔

وان یلتق الحی الجمیع تلاقنی
الی ذروۃ البیت الرفیع المصمد

''اور اگر سارا قبیلہ جمع ہو تو بلند مکان کی چوٹی پر وہ مجھ سے ملاقات کر سکے گا۔''

ابن عطاء کا قول ہے کہ صمد وہ ہے جو بننے بگڑنے سے بالاتر ہو۔

قتادہ کا قول ہے کہ صمد وہ ذات ہے جو اپنی مخلوقات کے بعد بھی باقی رہے۔

مرۃ الہمدانی سے مروی ہے کہ صمد وہ ذات ہے جسے کہنگی اور فنا لاحق نہ ہو۔

محمد بن کعب قرظی اور عکرمہ سے مروی ہے کہ صمد اس چیز کا نام ہے جس میں سے کچھ نکل

[1] معانی القرآن للزجاج : ٥/ ٢٩١ .

نہ سکے۔

میسرہ سے مروی ہے کہ انھوں نے صمد کے معنی مصمت (ٹھوس چیز) بتائے ہیں۔

ابن قتیبہ کا قول ہے کہ صمت دراصل صمد ہی ہے۔ گویا 'ت' 'د' سے بدل گئی ہے۔ لیکن امام ابن تیمیہ کے نزدیک یہاں ابدال نہیں اشتقاق اکبر ہے۔ ❶

جوہری کا قول دیکھیے، وہ کہتے ہیں کہ لغت میں مصمد کے معنی مصمت کے ہیں اور مصمت اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کھوکھلا پن نہ ہو۔ یہاں ظاہر ہے کہ مصمد اور مصمت میں اشتقاق اکبر ہے۔ لیکن مصمد بلحاظ مصمت کی نسبت زیادہ کامل ہے کیونکہ مصمد میں دال ہے اور مصمت میں ''ت'' اور ''د'' ت سے زیادہ قوی ہے۔ یحییٰ بن کثیر کا قول ہے کہ فرشتے صمد ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ خدا کی مخلوقات میں سے ہیں جب وہ صمد ہیں اور کھاتے پیتے نہیں تو ان کے خالق میں غنا اور کمال بطریق اولیٰ موجود ہونا چاہیے۔ اسی طرح بعض اسلاف کرام نے صمد کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ جو نہ کھائے اور نہ پیئے۔

الصمد سے الوہیتِ مسیح کا رد

قاعدہ عقلیہ ہے کہ جب دو نقیضوں میں سے ایک کو باطل کر دیا جائے تو دوسری کا وجود ضرور ثابت ہوتا ہے، یا ایک کا وجود ثابت ہو تو دوسری کا عدم ہو جائے گا مثلاً ثابت کیا جائے

---

❶ اشتقاق کا مطلب ہے: اخذ کلمة من کلمة اخریٰ یعنی ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے نکالنا، ماخوذ منہ (جس سے نکالا گیا ہو) اصل ہوتا ہے اور ماخوذ (جو نکالا گیا ہو) فرع ہوتا ہے۔ اشتقاق کی تین قسمیں ہیں: (۱) اشتقاق اکبر (۲) اشتقاق اصغر (۳) اشتقاق اوسط۔ اگر ماخوذ منہ اور ماخوذ کے کچھ حروف میں اشتراک عینی ہو اور کچھ حروف میں اشتراک جنسی ہو تو اشتقاق اکبر ہے مثلاً حزر، عزر، ازر۔ ان تینوں لفظوں کو دیکھئے کہ ہر ایک کے آخری دو حرف ایک جیسے ہیں۔ یہ اشتراک عینی ہے اور تینوں لفظوں کے شروع کے حروف مثلاً ح، ع، ا اگرچہ ایک جیسے نہیں مگر ان کی جنس مشترک ہے کیونکہ تینوں حروف حلقی ہیں۔ اگر ماخوذ منہ اور ماخوذ کے کلموں کے حروف اور ترتیب دونوں میں موافقت ہو تو اشتقاق اصغر ہے جیسے صدق اور صادق۔ اور اگر ماخوذ منہ اور ماخوذ کے کلموں کے حروف کے درمیان موافقت ہو مگر ترتیب میں عدم موافقت ہو تو اشتقاق اوسط ہے۔ (جلال الدین القاسمی)

کہ کسی خاص وقت میں رات نہیں ہے تو دن ضرور ہوگا اور اگر ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں دن ہے تو رات نہ ہوگی۔ اس قسم کی دلیل کو علمائے مناظرہ ''دلیل خلف'' کہتے ہیں اور جو حکم تتبع اور تلاش کے بعد لگایا گیا ہو اسے استقراء کہتے ہیں۔ جیسا کہ کسی مدرسے کے بعض طلباء سے ملنے پر انہیں بااخلاق پانے پر یہ حکم لگا دینا کہ اس مدرسے کے تمام طلباء بااخلاق ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی دلیل ہے مگر دلیل خلف کی بہ نسبت زیادہ کمزور ہے اور جو حکم بطور مشابہت لگایا جائے اسے تمثیل کہتے ہیں جیسے شراب پر حرمت کا حکم دیکھا۔ جس کی علت نشہ ہے اب بھنگ کے اندر نشہ معلوم ہونے پر اس پر بھی حرمت کر حکم لگا دیا اس میں شراب مقیس علیہ اور بھنگ مقیس ہے اور علت نشہ ہے جو دونوں میں مشترک ہے، انہی تینوں دلائل کی طرف قرآن نے اشارہ کر کے فرمایا:

﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ﴾ (المائدۃ: ۵/ ۷۵)

''نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، یقیناً اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے اور اس کی ماں صدیقہ ہے، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔''

یہ کہنا کہ مسیح تو صرف ایک رسول ہے تمثیل ہے یعنی جیسے اور رسول ہیں جنھیں بندگی سے بڑھ کر خدائی میں ذرہ برابر دخل نہیں، اسی طرح مسیح بھی اللہ کا رسول ہے نہ کہ خدا اور یہ کہنا کہ اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے استقراء کی طرف اشارہ کیا یعنی کل رسول جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں ان کے لیے بجز بندگی کے اور کوئی مرتبہ نہیں ہوا پھر مسیح کا کیونکر ہونے لگا اور یہ کہنا کہ مسیح کی ماں نیک بندی تھیں اور مسیح اور ان کی والدہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اسی بڑی زبردست دلیل کی طرف اشارہ ہے جسے دلیل خلف کہتے ہیں۔

یعنی جب مسیح کی ماں تھی اور وہ بھی اللہ کی نیک بندی تھی اور ماں بیٹے دونوں کھانے کے محتاج تھے تو ایک وجہ سے نہیں بلکہ کئی وجہ سے مسیح کی عبدیت ثابت ہوئی۔

〈۱〉.....ایک تو یہ کہ اس کی ماں ہے جس نے مسیح کو جنا۔

﴿۲﴾.....اس کی ماں اللہ تعالیٰ کی تابعداری بندی تھیں تو بیٹا بھی ضرور بالضرور اللہ تعالیٰ کا بندہ اور تابعدار ہوگا۔

﴿۳﴾..... دونوں ماں بیٹا طعام کے محتاج تھے ایسے کہ جیسے اور لوگ محتاج ہوں اور ظاہر ہے کہ جو محتاج الی الغیر ہو وہ مخلوق ہے وہ کبھی خدا نہیں ہوسکتا اور ابھی آپ نے پڑھا ہے کہ وہ الصمد ہے اور صمد وہ ہے "اَلَّذِیْ لَا یَاکُلُ وَلَا یَشْرَبُ" (جو کھائے نہ پیئے) کیونکہ اگر خدا بھی طعام وغیرہ کا محتاج ہو تو اس میں شک نہیں کہ طعام بلکہ دنیا کی کل چیزیں حادث ہیں۔ یعنی ایک وقت سے ان کی ابتداء ہوئی ہے۔ جس سے پہلے وہ نہ تھیں۔ پس جس وقت وہ نہ تھیں تو ان کے بغیر خدا کا گزارہ کیسے چلتا تھا یا خدا بھی اس وقت نہ تھا تو خدا بھی حادث ہوا یا تھا تو سہی مگر بڑی دقت سے گزارہ کرتا ہوگا کیونکہ اس بات کو ہمارے مخالفین یعنی عیسائی بھی مانتے ہیں کہ جو کھانے وغیرہ کا محتاج ہو وہ بے شک مخلوق ہوگا۔ پس قرآن سے تینوں دلیلوں کی شرح ہوگئی۔

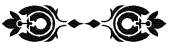

ولادت کا معنی

﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾

''وہ نہ والد ہے۔ نہ مولود ہے۔''

ولادت اور تولد کے معنی ہیں ''پیدا ہونا'' اور کسی چیز کے پیدا ہونے کے لیے پہلے دو اصلوں کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ یہ دو اصل متولد یعنی اس پیدا ہونے والی چیز کی جنس سے ہوں یا نہ ہوں۔ جس طرح حیوان میں توالد کے لیے دو اصلوں کا وجود لازمی ہے۔ اسی طرح غیر حیوان میں بھی توالد دو اصلوں ہی سے ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسی بھی تیسری چیز کے وجود میں آنے کے لیے پہلے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے اور یہ دونوں چیزیں جس سے تیسری چیز وجود میں آتی ہے وہ دونوں بھی ایک دوسرے کی مخالف جنس ہونی چاہئیں۔ اس اصول کی روشنی میں آگ کو دیکھئے کہ زَندین یعنی چقماقوں کے رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سی چیز آگ بن گئی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ دو چقماقوں کے درمیان جو ہوا ہے وہ آگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ ہوا منقلب ہو کر آگ بنتی تو نیچے نہ گرتی۔ کیونکہ ہوا کا خاصہ صعود (اوپر کو جانا) ہے نہ کہ ہبوط (نیچے کی طرف گرنا)۔ ثابت یہ ہوا کہ دو چقماقوں میں سے نیچے کی چیز مثلاً صوفان اور حراق پر چنگاری پیدا کی جاتی ہے۔ رگڑ کے باعث ان سے مادہ خارج ہوتا ہے۔ یہی مادہ جب آگ میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پاس کی ہوا بھی آگ میں تبدیل ہو جاتی ہے، پتھر سے اگر ثقیل مادہ خارج نہ ہو تو آگ نیچے نہیں گرتی جبکہ رگڑ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ آگ نیچے ہی گرتی ہے۔ قرآن کی آیت ﴿فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝۸۰﴾ (یٰسٓ: ۳۶/ ۸۰) کا اشارہ چقماق کی طرف ہے۔ اہل لغت جوہری وغیرہ نے کہا ہے کہ

زَنَدْ اس چیز کو کہتے ہیں جس کو رگڑ کر آگ نکالی جاتی ہے زندْاوپر والے چقماق کو کہتے ہیں۔ نیچے کے چقماق کو زَندہ کہتے ہیں اوپر والا چقماق نر کہلاتا ہے اور نیچے والا چقماق مادہ کہلاتا ہے، مادہ چقماق میں سوراخ ہوتا ہے دونوں چقماق جمع ہوجائیں تو زَنَـدَیـن (دو چقماق) کہلاتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جس مقام پر چقماق کو رگڑا جاتا ہے وہ عورت کی رحم کی شکل کا ہوتا ہے اس جگہ آگ کا لوتھڑا بنتا ہے جسے حراق اور صوفان کہا جاتا ہے اور دوسری چیزوں کی بہ نسبت زیادہ تیزی کے ساتھ آگ پکڑ لیتا ہے اور جس طرح بعض اوقات عورت کے رحم میں لوتھڑا نہیں بنتا اسی طرح چقماق میں بھی کبھی کبھی لوتھڑا نہیں بنتا۔ اب دیکھئے آگ زندین کی جنس سے نہیں ہے اور زندین بھی مخالف جنس والے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا﴾ (یٰسٓ: ۳۶/ ۸۰)

''وہ اللہ ہے جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی۔''

متعدد مفسرین کا قول ہے کہ دو درخت ہوتے ہیں ایک کا نام ''مرخ'' اور دوسرے کا نام عفار ہے جو شخص اس سے آگ نکالنا چاہتا وہ ان دو درختوں سے مسواکوں کے برابر دو سبز ٹہنیاں کاٹ لیتا ان سے خواہ پانی کے قطرے گر رہے ہوں۔ لیکن اگر مرخ کو عفار پر رگڑا جائے تو ان دونوں سے آگ نکل آتی ہے۔ ان دو درختوں میں سے مرخ نر درخت اور عفار مادہ درخت کہلاتے ہیں۔

عرب کہتے ہیں کہ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے مگر مرخ اور عفار کو سب پر امتیاز حاصل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عناب کے علاوہ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے یہاں بھی دیکھئے کہ آگ مرخ اور عفار کی جنس سے نہیں ہے پس معلوم ہوا کہ جس طرح مرد و عورت کے مادہ سے بچہ تولد ہوتا ہے اسی طرح آگ بھی نر اور مادہ سے خارج ہونے والے مواد سے ہی بنتی ہے۔

حیوان متولد و حیوان متوالد

حیوان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم تو متولد حیوانوں کی ہے جیسے وہ کیڑے جو پھل

پھول اور سرکہ وغیرہ سے پیدا ہوتے ہیں یا مثلاً جوئیں جو جلد انسانی کی میل کچیل سے پیدا ہوتی ہیں یا چوہے، پسو وغیرہ جو پانی اور مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری قسم متوالد حیوان کی ہے، مثلاً چوپائے وغیرہ جو ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔

رہا انسان کا معاملہ تو اس کی ولادت اور تخلیق کی ممکنہ اقسام چار ہیں:

﴿۱﴾ حضرت آدم علیہ السلام بغیر مرد وعورت کے پیدا کیے گئے۔

﴿۲﴾ حضرت حوا بلا عورت کے پیدا کی گئیں۔

﴿۳﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عورت سے بلا مرد کے پیدا کیے گئے۔

﴿۴﴾ بقیہ مخلوق مرد وعورت سے پیدا کیے گئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اصول یہ ہے کہ جمیع متولدات (تمام پیدا ہونے والی چیزیں) دو اصلوں سے پیدا کی گئی ہیں تو مذکورہ بالا تحقیق کی چار قسموں میں سے ابتدائی تین قسموں میں یہ اصول ٹوٹ رہا ہے کیونکہ ان تینوں قسموں کی تخلیق دو اصلوں سے نہیں ظاہر ہورہی! تو جواب یہ ہے کہ تینوں میں وہی اصول کارفرما ہے۔ اصول کہیں ٹوٹا نہیں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھئے کہ ان کی اصل دو چیزیں ہیں۔ مٹی، پانی، ورنہ صرف مٹی جس میں پانی نہ ملا ہو کوئی جاندار چیز یا سبزی نہیں پیدا ہوسکتی۔ سبزی بھی ساری کی ساری دو اصلوں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال حوا کا ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے بنائی گئی ہیں تو ان کی بھی تخلیق کے دو ہی اصل ہوئے۔ رہا معاملہ حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کا تو جاننا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف مریم سے نہیں ہوئے بلکہ مریم اور نفخ جبریل (جبرائیل کی پھونک) سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝١٧ قَالَتْ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ۝١٨ قَالَ إِنَّمَآ أَنَا۠ رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَٰمًا زَكِيًّا ۝١٩ ...... فَحَمَلَتْهُ﴾ (مریم: ۱۹/ ۱۷ تا ۲۲)

”تو ہم نے مریم کی طرف جبرائیل کو بھیجا، وہ ایک پورے آدمی کی شکل میں ان

کے سامنے کھڑے ہوئے۔ آپ کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتی ہوں اگر تو خدا ترس ہے تو میرے سامنے سے ہٹ جا۔ جبرائیل نے کہا: میں تیرے رب کا بھیجا ہوا آیا ہوں اس لیے کہ تجھے ایک پاکیزہ بچہ دوں..... پس وہ حاملہ ہوگئیں۔''

یعنی جب جبرائیل نے پھونکا تو حضرت مریم کو حمل رہ گیا۔ اسی لیے حضرت مسیح کو اسی نفخ کے اعتبار سے ''روح منہ'' کا خطاب ملا۔

اس تفصیل سے بتانا مقصود یہ ہے کہ قائم وجودوں میں سے جس چیز کے متعلق بھی تولد (پیدائش) کا لفظ استعمال کیا جائے گا یہ ضروری ہے کہ وہ دو اصلوں سے بنی ہو اور دونوں میں سے کچھ کچھ حصہ جدا ہو کر بنی ہو۔ اگر اللہ کو والد مان کر یہ کہا جائے کہ اللہ کا کوئی مولود (بیٹا) ہے تو لابدی ہے کہ والد سے کچھ مادہ خارج ہو کر اس سے جدا ہو جائے اور دوسرے دو اصلوں سے تولد ہوا ہو اور اللہ چونکہ صمد ہے اس لیے امر محال ہے کہ اس سے کوئی چیز خارج ہو [1] کیونکہ جتنا بھی اس سے خارج ہو کر الگ ہوگا۔ ظاہر ہے اتنا نقص اس کی ذات میں لازم آئے گا جبکہ اللہ کی ذات تمام نقائص سے مبرا ہے۔

---

[1] بعض سلف نے کہا کہ صمد وہ ہوتا ہے جس سے کوئی چیز نہیں نکلتی، اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ کلام نہیں کرتا کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلام اس سے نکلا ہے۔ متکلم کے منہ سے کلام کے نکلنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ بات کرتا ہے اور اس سے بات سنی جاتی ہے اور دوسرے آدمی تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے میں پیدا نہیں ہوتی جیسا کہ جہمیہ کا قول ہے یہ خروج (نکلنا) اس معنی میں نہیں ہوتا کہ جو اشیاء متکلم کے ساتھ قائم ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز جدا ہو کر دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو مخلوقات کی صفات سے بھی بعید ہے کہ صفت اپنے محل کو چھوڑ کر غیر محل میں چلی جائے۔ چہ جائیکہ خالق جل جلالہ کی صفات کے ساتھ یہ کیفیت وارد ہو۔ علم و کلام کی شان یہ ہے کہ جب عالم اور متکلم سے استفادہ کیا جاتا ہے تو علم اور کلام اپنے محل یعنی عالم اور متکلم سے گھٹتا نہیں ہے وہ ایک روشنی ہے جس سے ہر شخص ضیاء اندوز ہوتا ہے اور وہ روشنی اپنے محل میں علیٰ حالہ قائم رہتی ہے۔ ذرا بھی نہیں گھٹتی، اس لیے سلف کا یہ قول کہ الصمد وہ ہوتا ہے جس سے کوئی چیز نہ نکلے اس معنی میں صحیح ہے کہ اس سے کوئی چیز جدا نہیں ہوتی۔ (جلال الدین القاسمی)

دوسرے اللہ کے لیے بیوی ہونا بھی ممتنع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ (الانعام: ٦/ ١٠١)

''اور اس کی کوئی بیوی نہیں۔''

اور اگر اس کے لیے کوئی مولود بیٹا مانا جائے تو اولاد باپ کا جز ہوتی ہے جبکہ اس کا کوئی جز نہیں ہوسکتا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا﴾ (الزخرف: ٤٣/ ١٥)

''انھوں نے اللہ کے بعض بندوں کو اس کا جز یعنی اولاد قرار دے رکھا ہے۔''

ابنیت اور مولودیت کا رد

قرآن کریم نے مولودیت و ابنیت کی تردید اس لیے کی کہ نزول قرآن سے پہلے جس طرح اور بہت سے غلط اور گمراہ کن عقائد دنیا کی قوموں میں مقبول اور مروج تھے اسی طرح یہ مہمل اور لغو عقیدہ بھی مختلف اقوام میں موجود تھا۔ مثلاً یونان میں ''اپالو'' شام میں بیکس (Bacches) مصر میں ''ہورس'' اور عراق میں ''متھرا'' کو خدا کا اکلوتا بیٹا تسلیم کیا جاتا تھا۔ انہی اقوام کی تقلید میں یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا تھا۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾

(التوبة: ٩/ ٣٠)

''یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔''

عیسائیوں کا جو فرقہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اللہ کا بیٹا ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے وہ ملکانیہ ہے۔ اگر کوئی خدا کا بیٹا ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ اگر وہ بھی خدا ہے تو خدا دو ہوگئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دونوں مل کر کائنات کا نظام چلا رہے ہیں یا ان میں سے کوئی معطل ہے یا خدائی ان میں منقسم ہے۔

اگر پہلی صورت تسلیم کی جائے تو سوال یہ ہے کہ بیٹے کی ولادت سے پہلے اکیلا خدا اس

کائنات کا انتظام کیسے کرتا تھا۔ اگر کرسکتا تھا تو بیٹے کا وجود بیکار ہوا۔

اگر دوسری صورت صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ معطل اور بیکار خدا کو خدا تسلیم کرنے سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔

اگر تیسری صورت تسلیم کرلی جائے تو سوال یہ ہے اس کائنات کا کون سا حصہ باپ کے زیر اقتدار ہے اور کونسا بیٹے کے؟ [1]

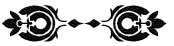

[1] مولودیت کے عقیدے کی لغویت واضح کرنے کے لیے مثالاً چند اعتراض میں نے کردیے ہیں۔ ورنہ اس موضوع کی تفصیل ایک ضخیم کتاب کی متقاضی ہے۔ (جلال الدین القاسمی)

اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں

﴿وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾

''اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے۔''

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو اس کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر سکے۔

اللہ نے قرآن میں اپنے رسول کو بکثرت مقامات پر تسبیح کا حکم دیا ہے تسبیح تنزیہ کو کہتے ہیں۔ تنزیہ یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز پائی جائے جس کی کوئی نظیر نہ ہو نہ شکل میں نہ اور کسی چیز میں۔ مثلاً اللہ وجود کی صفت سے متصف ہے اور اس کی مخلوق بھی صفت وجود سے متصف ہے۔ لیکن اللہ کا وجود مخلوق کے وجود کی طرح نہیں ہے کیونکہ مخلوق کا وجود عدم سے ہے پھر اس کا وجود عدم کی طرف چلا جائے گا اور اللہ کا وجود نہ عدم سے ہے نہ عدم کی طرف جائے گا۔ یہاں دیکھئے وجود کی صفت قدر مشترک ہے مگر آپ نے اللہ تعالیٰ کو منزہ کر دیا کہ اس کی مخلوق کسی بھی چیز میں اس کے مساوی نہیں اور جب آپ سنیں کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہے، اس کی پنڈلی ہے اس کے ہاتھ ہیں پیر ہیں تو آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس کا چہرہ، ہاتھ، پیر اور پنڈلی مخلوق کے چہرے، ہاتھ، پیر اور پنڈلی کی طرح ہے۔ بے شک ہمارے رب کا وجود ہے۔ آنکھ، کان، ہاتھ پیر ہیں مگر یہ وجود اور آنکھ، کان، ہاتھ پیر مخلوق کے وجود اور آنکھ، کان، ہاتھ کی طرح نہیں ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے، دیکھئے اللہ حی (زندہ) ہے اور انسان بھی حیات سے متصف ہے تو کیا انسان کی حیات اللہ کی حیات کی طرح ہے ہرگز نہیں۔ خلاصہ یہ نکلا کہ اللہ کے ناموں میں

سے کوئی نام یا اس کے اوصاف میں سے کوئی وصف آئے جس نام اور وصف کا مثل مخلوق میں بھی پایا جاتا ہو تو ہمارے سامنے دو باتیں ہیں: (۱) تمثیل اور (۲) تعطیل تعطیل۔ تعطیل کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ کے پاس کان نہیں، کیونکہ مخلوق کے پاس کان ہیں۔ کیا ہم ایسا کہہ سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں کیونکہ اللہ نے خود اپنے لیے کان ثابت کیا ہے تو آپ کو ماننا ہے کہ اس کے کان ہیں مگر اس کان کی کیفیت کیا ہے یعنی وہ کان کیسا ہے یہ تمھارا کام نہیں اور نہ یہ کیفیات محل ایمان ہیں۔ جب آپ دیکھیں کہ اللہ نے اپنے آپ کو کسی وصف سے متصف کیا ہے جو ممکن ہے کہ اس کی مخلوق میں بھی پایا جاتا ہو تو آپ کو تنزیہ کرنا ہے یعنی آپ کو کہنا ہے کہ ''یہ'' اس کے مثل نہیں۔

مسئلہ توحید کے متعلق پہلے تمام مذاہب میں جو حقیقت میں توحید کا پیغام لے کر دنیا میں آئے تھے تین اسباب سے غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہوئیں:

① جسمانی تشبیہ و تمثیل۔

② صفات کو ذات سے الگ اور مستقل ماننا۔

③ افعال کی نیرنگیوں سے دھوکہ کھانا۔

جسمانی تشبیہ و تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اور خدا کی صفتوں کو اور خدا اور بندے کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے مادی تمثیلیں اور تشبیہیں ایجاد کر لی جائیں جیسا کہ دیگر مذاہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں۔ غلط فہمیوں کا دوسرا سبب صفات کا مسئلہ ہے یعنی صفات کو ذات الٰہی سے الگ مستقل وجود کے طور پر تسلیم کرنا۔ ہندوؤں کے عام مذاہب میں خداؤں کا جو لاتعداد لشکر نظر آتا ہے وہ حقیقت میں اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ ہر صفت کو انھوں نے علیحدہ اور ایک مستقل وجود مان لیا، اس طرح ایک خدا کے ۳۳ کروڑ خدا بن گئے۔ ہندو مذہب کے فرقوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی ایک مسئلہ صفات کی تجسیم اور مستقل وجود کے تخیل سے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

خدا کی تین بڑی صفتیں

❶ خالقیت (پیدا کرنا) ❷ قیومیت (قائم رکھنا) ❸ ممیتیت (فنا کرنا)۔

ہندو فرقوں نے ان تین صفتوں کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کرلیا اور برہما وشنو اور شیو، خالق قیوم ممیت، تین مستقل ہستیاں بن گئیں۔ یہی حال عیسائیوں کا ہوا، انھوں نے خدا کی تین دیگر بڑی صفتوں حیات، علم، ارادہ کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کرلیا۔ حیات باپ ہے۔ علم روح القدس ہے، ارادہ بیٹا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں ایک ذات کی صفتیں ہیں صفات کی تعداد اور اختلاف سے موصوف ہیں۔ تعدد اور اختلاف نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی کسی کا باپ ہے، کسی کا بھائی کس کا خاوند اور کسی کا چچا، کسی کا بھتیجا ہے۔ ان تمام مختلف القاب کے باوجود یہ شخص واحد ہی رہتا ہے۔ جب کثیف چیزوں کا یہ حال ہے تو خدا کی صفات کے تعدد سے اس کی ذات میں تعدد کس طرح سے پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ تمام موجودات سے زیادہ لطیف بلکہ سرچشمہ لطافت ہے۔ گمراہی کا تیسرا سرچشمہ افعال کی نیرنگی ہے۔ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ ان مختلف افعال کی کرنے والی مختلف ہستیاں ہیں۔ کوئی ہستی مارتی ہے کوئی جلاتی ہے، کوئی لڑاتی ہے کوئی صلح کراتی ہے، کوئی علم کا دیوتا ہے کوئی دولت کی دیوی ہے۔ ان نادانوں نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ ایک ہی ہستی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے افعال ہیں۔

صفات لاعین اور لاغیر ہیں

خدا کی صفات کی دو قسمیں ہیں، علامہ ابن تیمیہ ان کو صفت ذات اور صفت فعل سے تعبیر کرتے ہیں۔ خدا کی صفات ذاتیہ کا تعلق اس کی ذات سے ایسا ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ و بو، آفتاب کے ساتھ حرارت اور روشنی۔ آگ کے ساتھ گرمی کا تعلق و قیام ہے۔ رہی صفت فعل تو یہ وہ صفت ہے، جو کسی معلول اور مفعول کے ساتھ تعلق کی وجہ سے خدا کے لیے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً آگ کی تو ایک صفت حرارت ہے جو اس کی ذاتی ہے۔ جب آگ کا وجود ہوگا تو حرارت ضرور ہوگی اور ایک صفت ہے جلانا تو ظاہر ہے کہ یہ صفت اس رابطہ پر دلالت کرتی ہے جو آگ کے اور کسی چیز کے درمیان پایا جاتا ہے۔ صفت فعل، صفت

ذات کا ہی پرتو ہوتی ہے۔لیکن چونکہ یہ صفت اس تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسری چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے۔اس لیے اس صفت کو ذاتِ موصوف سے وہ تعلق نہیں ہوتا جو صفت ذات کو ہوتا ہے اس بنا پر اس صفت کا ظہور جو مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا اس کا اثر ذات پر کچھ نہیں ہوتا یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صفت کی وجہ سے ذات موصوف میں کچھ تغیر ہوگیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ خدا میں کون کون سی صفتیں پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس ذات گرامی کو اللہ کہتے ہیں وہ تمام صفات کمالیہ کا مجمع ہے۔اس کی واضح ترین دلائل یہ ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تو ہر نقص کے مقابل میں کوئی کمال پایا جانا ضروری ہے۔اب دیکھئے کہ انسان کا وجود ناقص ہے تو لامحالہ اس کے مقابلے میں ایسا وجود پایا جانا ضروری ہے جو کامل ہو، رہا اس سوال کا حل کہ صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات تو اس کا جواب یہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ کو اس کی ذات سے ایسی نسبت ہے کہ ان صفات کو نہ عین ذات کہہ سکتے ہیں نہ غیر ذات مثال کے طور پر کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے اور آپ اسے اپنے ریڈیو سیٹ پر سنتے ہیں آواز کو کم یا زیادہ کرنے والے سوئچ کو گھما کر کبھی آپ آواز کو مدھم کرتے ہیں اور بلند کرتے ہیں آپ کے سوئچ گھمانے سے مقرر کی اصل آواز میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی مقرر تو ایک ہی آواز سے اپنی تقریر پڑھتا چلا جارہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہلکا پن یا تیزی صفت کس کی ہے؟ ظاہر ہے کہ آواز ہی کی صفت ہے اور دلیل یہ ہے کہ آواز کے گھٹنے بڑھنے پر ہم بے تکلف بول اٹھتے کہ آواز کم ہوگئی یا زیادہ ہوگئی کوئی شخص یہ سوال کرسکتا ہے کہ اللہ کی ایک صفت متکلم ہے۔اس نے موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی اور انہیں مخاطب کر کے کلام کیا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ازل میں ندا دی تھی اور ان سے کلام کیا تھا اور وہ برابر ندا دیتا رہا۔ابن تیمیہ نے فرمایا کہ ذات باری کے ساتھ حوادث کا قیام ہوسکتا ہے اس کا موسیٰ سے کلام اور مخاطبت ازل میں نہیں تھی بلکہ حادث تھی اور متکلمین یہ کہتے ہیں کہ حوادث کا قیام اللہ کے ساتھ ناجائز ہے۔لیکن حق وہی ہے

جوابن تیمیہ نے کہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ﴾ (طٰہٰ: ۲۰/ ۱۱)

''پس جب موسیٰ وہاں آئے تو انہیں ندا دی گئی۔''

دیکھئے اس میں ندا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے موقت ہے۔ امام ابن تیمیہ کے اس قول سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ قرآن کے حروف کو حادث مانتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ عربی الفاظ وحروف جن سے انسانی کلام مرکب ہوتا وہ بلاشبہہ حادث ہیں لیکن یہی الفاظ و حروف خدا کی صفت کا مظہر اور تجلی گاہ بن جاتے ہیں تو اب ہم ان کو اپنے کلام کے الفاظ و حروف پر قیاس کر کے مخلوق اور حادث نہیں کہہ سکتے۔

جسم باری تعالیٰ کی بحث

لفظ جسم ایک نیا اور مبتدعانہ لفظ ہے۔ کسی شخص کو یہ زیبا نہیں کہ وہ اس لفظ کو اللہ کے متعلق زبان پر لائے۔ قرآن وسنت سے کسی صحابی اور تابعی کے قول سے اور امت مسلمہ کے کسی امام کی تحریر وتقریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق نفیا یا اثباتاً یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہ تفسیر سورہ اخلاص میں لکھتے ہیں کہ جس شخص نے جسم کا لفظ استعمال کیا اور اس سے مرکب مراد نہ لیا تو وہ لغت عرب کے دائرے سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی دوسری سے مرکب ومؤلف ہوتی ہے وہ اس کی محتاج ہوتی ہے اور صمد غنی ہوتا ہے مرکب کبھی صمد نہیں ہوسکتا۔

جہمیہ معتزلہ اور بہت سے فلاسفہ اور باطنیہ صفات کے منکر ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اثبات صفات کے لیے جسم کا ہونا ضروری ہے اور جسم تو ہے نہیں اس لیے اللہ کی صفات کیسے ثابت ہوسکتی ہے؟ ان کے نزدیک صفات ان اعراض کو کہتے ہیں جو ایک جسم کے ساتھ قائم ہوتے ہیں جس جسم کا حلیہ ان کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ پھر کہتے ہیں کہ رویت معائنہ کے بغیر نہیں ہوسکتی اور معائنہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب مرئی کسی خاص سمت میں ہو اور کوئی چیز کسی سمت میں اس وقت ہوسکتی ہے جب وہ جسم ہو، عقیدہ طحاویہ کے فاضل شارح نے لکھا ہے

''اللہ تعالیٰ صفت کمال، یعنی صفات ذات اور صفات فعل دونوں کے ساتھ ہمیشہ سے متصف رہا ہے..... کیونکہ خدا کی تمام صفات، صفات کمال ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا صفت نقص ہے۔

مسئلہ خیر و شر

تمام افعال کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک خیر اور ایک شر۔ یا یوں کہئے کہ ایک اچھی اور دوسری بری۔ اس خیال سے کہ ایک ہی ذات سے خیر و شر کے دو متضاد کام نہیں ہو سکتے، زردشتیوں نے خیر کے لیے الگ خدا اور شر کے لیے الگ خدا ٹھہرایا۔ خالق خیر کا نام یزداں اور خالق شر کا نام اہرمن رکھا۔ یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ وہ خیر و شر کی حقیقت نہیں سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ خیر و شر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ کوئی چیز اپنی اصل کے لحاظ سے نہ خیر ہے، نہ شر۔ وہ خیر و شر انسان کے صحیح یا غلط استعمال سے بن جاتی ہے۔ مثلاً آگ ہے۔ اگر اس سے کھانا پکاؤ، یا انجن چلاؤ یا غریب آدمی کو تاپنے دو تو یہ خیر ہے اور اگر اسی آگ سے کسی غریب کا گھر جلا دو تو یہ شر ہے آگ اپنی اصل کے لحاظ سے نہ خیر ہے نہ شر۔ انسان اپنے استعمال سے اسے خیر اور شر بنا دیتا ہے۔ چھری اور تلوار خود نہ خیر ہیں نہ شر۔ تم ان کو جیسا استعمال کرو ویسی ہیں، تاریکی نہ خیر ہے نہ شر، اگر تاریکی کو لوگوں کے گھروں میں چوری کا ذریعہ بناؤ تو شر ہے اور اگر اپنے کو چھپا کر نیکیوں کے کرنے کا ذریعہ بناؤ تو خیر ہے یہ کائنات بھی اپنی اصل کے لحاظ سے نہ ہدایت کرنے والی ہے نہ گمراہ کرنے والی تم اپنی عقل کے اختلاف سے ہدایت یاب ہوتے ہو یا گمراہ ہو جاتے ہو۔ قرآن میں ہے:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾

(البقرۃ: ۲/ ۲۶)

''اللہ اپنے کلام کے ذریعہ بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے اور انہی کو گمراہ کرتا جو فاسق ہیں۔''

اس آیت اور اسی جیسی بہت سی آیتوں سے معلوم ہوگا کہ ہدایت اور ضلالت دونوں کی

علت اللہ ہی ہے مگر دونوں کے لیے ابتدائی محرکات انسان ہی کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ فسق انسان نے کیا، جس کے نتیجے میں گمراہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ خیر وشر ہر چیز کا ظہور اللہ ہی کی مشیت سے ہوتا ہے۔ لیکن خیر وشر میں فرق یہ ہے کہ خیر اللہ کی رحمت کے اقتضا سے ظہور میں آتا ہے اور شر انسان کے اپنے عمل سے مترتب ہوتا ہے۔ اس پہلو سے شر کا تعلق انسان کے اپنے نفس سے ہے۔ یہ حقیقت یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ خیر مطلق ہے، اس نے یہ دنیا اپنی رحمت کے لیے بنائی ہے۔ اس وجہ سے اس کی طرف کسی شر کی نسبت اس کی پاکیزہ صفات کے منافی ہے۔ اللہ نے انسان کو ایک خاص دائرے میں آزادی بخشی ہے۔ یہ آزادی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ پھر اس دائرے کے اندر بھی یہ خدا کی مشیت اور اس کی حکمت کے تحت ہے۔ خدا کی مشیت کے بغیر انسان اپنے کسی ارادے کو پورا نہیں کرسکتا۔ انسان کے نیک ارادے اسی کی توفیق بخشی سے پورے ہوتے ہیں اور تمام ارادے بھی اس کے مہلت دینے سے بروئے کار آتے ہیں۔ اگر اللہ کسی کے برے ارادے کو بروئے کار لانے دیتا ہے اس پہلو سے تو وہ خدا کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ اس کا بروئے کار لانا خدا کی مشیت اور اذن سے ہوا لیکن دوسرے پہلو سے وہ انسان کا فعل ہے کیونکہ اس کا ارادہ انسان نے خود کیا۔

اِنَّا اور نَحْنُ کی بحث

نجران کے نصاریٰ نے کہا تھا کہ ہماری دلیل قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں اِنَّا اور نَحْنُ جمع کے الفاظ ہیں۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ معبود تین ہیں کیونکہ جمع کا اطلاق کم سے کم تین پر ہوتا ہے۔ ان نصرانیوں نے محکمات قرآنیہ کو چھوڑ دیا اور متشابہ آیات کے پیچھے پڑ گئے، محکم آیات میں صاف مذکور ہے کہ معبود ایک ہے۔ اِنَّا اور نَحْنُ کے الفاظ کی بحث چھیڑ کر ان کی غرض فتنہ برپا کرنا اور لوگوں کے دلوں میں کفر پیدا کرنا تھا۔ یہ الفاظ اس واحد کے لیے بولے جاتے ہیں جس کے مددگار ہوں اور مددگار یا تو شریک ہوں گے یا مملوک۔ اس لیے یہ الفاظ متشابہ ہوگئے جس کے ساتھ شریک ہوں۔ وہ کہتا ہے: فَعَلْنَا نَحْنُ كَذَا (ہم نے ایسا کیا)

اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان میں ممتنع ہے اور جس کے مددگار مملوک اور مطیع لوگ ہوں جو اسے بادشاہ سمجھ کر اس کی اطاعت کریں وہ کہتا ہے: فَعَلْنَا كذا یعنی ہم نے اپنے اہل ملک اور غلاموں کے ذریعہ یہ کیا اور خدا کے سوا ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے وہ خود جہان کی تدبیر و انتظام کرتا ہے جو کام کرنا چاہے اور جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ کرے اس کے فرشتے حکم کی بجا آوری کے لیے مستعد رہتے ہیں، وہ اس کے قاصد اور مطیع ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اِنَّا اور نَحْنُ کہنے کا زیادہ حق ہے کیونکہ اس کے سوا کسی کی مملکت اور ملکیت مکمل نہیں اور کسی کا حکم پورے طور پر نہیں مانا جاتا۔

حلول و اتحاد اور تصورِ اوتار کا رد

ہندو قوم نے رام اور کرشن کو خدا کا اوتار سمجھ لیا، ان کی دیکھا دیکھی جین دھرم کے پیروؤں نے مہابیر کو اور بدھ دھرم کے متبعین نے گوتم بدھ کو خدا کا اوتار سمجھ لیا۔ عیسائیوں کا ایک فرقہ یعقوبیہ ہے، یہ مسیح بن مریم کو خدا مانتے ہیں۔ قرآن میں اسی عقیدے کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ ﴾

(المائدۃ : ۵/ ۱۷)

''بلاشبہہ یقیناً وہ لوگ کافر ہوگئے جنھوں نے کہا کہ بے شک اللہ مسیح ہی تو ہے، جو مریم کا بیٹا ہے۔''

ایک دوسرا فرقہ ملکانیہ ہے جو مسیح کے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) ہونے کا قائل ہے، اس آیت میں انہی کی طرف اشارہ ہے:

﴿ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ﴾ (التوبۃ : ۹/ ۳۰)

''نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔''

تیسرا فرقہ نسطوریہ ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ اللہ تین میں سے ایک ہے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ ﴾ (المائدۃ : ۵/ ۷۳)

''جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے ایک ہے وہ کافر ہیں۔''

اس آیت سے اسی فرقے کی طرف اشارہ ہے۔ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو سولی دے دی گئی مگر قرآن میں ہے کہ مسیح کو موت نہیں آئی اور عیسائیوں کا کہنا ہے کہ عیسیٰ کے ناسوت کو سولی دی گئی لاہوت کو نہیں۔ وہ کہتے ہیں ناسوت اور لاہوت اس طرح مل گئے جس طرح پانی دودھ میں مل جاتا ہے یہ تشبیہ یعقوبیہ فرقے کی ہے۔ یا لاہوت اور ناسوت اس طرح مل گئے ہیں جس طرح آگ لوہے سے مل جاتی ہے۔ یہ تشبیہ ملکانیہ فرقے کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں جو چیز پانی کو پہنچے گی وہ دودھ کو بھی پہنچے گی کیونکہ دونوں چیزیں اس طرح مل گئی ہیں کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں رہ گئی ہیں۔ یہی حال آگ اور لوہے کا ہے، جو لوہے میں حلول کر گئی ہے اگر لوہے کو پیٹا جائے تو آگ بھی متاثر ہوگی اس طرح بدن کو ضرب لگائی جائے تو ضرب کی تکلیف روح کو بھی پہنچے گی۔ عیسائیوں نے اتحاد کے ثبوت میں جو تمثیل پیش کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو ناسوت کو پہنچے وہی لاہوت کو بھی پہنچے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے سولی دی اور ان کے منہ پر تھوکا اس سے ناسوت اور لاہوت دونوں کو تکلیف پہنچی۔ اتحاد و حلول کے مسئلے کو تسلیم کرنے پر یہ بات لازمی ہے کیونکہ اتحاد وہ ہے کہ جو ایک چیز کو پہنچے اس میں دوسری چیز بھی شریک ہو اگر ایسا نہ ہو تو یہ اتحاد نہیں بلکہ تعدد ہے۔

عیسائیوں کی یہ کتنی بڑی گمراہی ہے کہ انھوں نے خالق ارض و سما کو ایک بشر کے ساتھ متحد کر دیا، اسے عورت کے بطن میں پہنچایا۔ یہی نہیں بلکہ اللہ کی خبیث مخلوق یہود نے اسے پکڑا، اس کے چہرے پر تھوکا، اس کے سر پر کانٹے رکھے اور اسے سولی دے دی۔ یہاں ہم عیسائیوں سے ایک سوال کریں گے کہ یہ بتاؤ کہ لاہوت ان شریر اور خبیث یہودیوں کو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے درپے تھے ہٹانے پر قادر تھا یا نہیں؟ اگر کہیں کہ قادر نہیں تھا تو لازم آئے گا کہ وہ شریر یہودی رب العالمین سے زیادہ قادر تھے اور رب العالمین شریروں کے سامنے بے بس مقہور و مغلوب تھا! یہ تو سب سے بڑا کفر ہے کہ اس سے اللہ کی ذات میں نقص لازم آتا ہے اور اگر کہیں کہ قادر تھا تو سوال یہ ہے کہ ناسوت کی چیخ پکار پر اُس نے اس کی مدد

کیوں نہیں کی؟ جبکہ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ ناسوت اس وقت فریاد کر رہا تھا: اِلٰهِی اِلٰهِی لِمَ تَرَكْتَنِي؟ ''اے اللہ! اے اللہ! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟''

استواء علی العرش

اگر کوئی سوال کرے کہ اللہ کہاں ہے تو جواب یہ ہوگا کہ وہ آسمان پر ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا﴾

(الملك : ٦٧/ ١٧)

''کیا تم لوگ اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو کہ آسمان پر ہے کہ وہ تم پر ایک ہوائے تند بھیج دے۔''

اور ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان دعا میں اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح کسی چھوٹے بڑے سے سوال کریں کہ اللہ کہاں ہے تو وہ انگلی اوپر اٹھا کر کہے گا کہ وہ آسمان میں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے اس لونڈی سے جو آزاد کرنے کے لیے پیش کی گئی تھی سوال فرمایا: ''اَيْنَ اللّٰهُ'' (اللہ کہاں ہے) تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''فِي السَّمَآءِ'' (آسمان پر) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسے آزاد کردو یہ مومنہ لونڈی ہے۔ [1]

اگر ''فِي السَّمَآءِ'' (اللہ آسمان پر ہے) [2] کا جملہ صحیح نہ ہوتا تو اللہ کے رسول اس لونڈی کو مومنہ نہ کہتے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ فِي السَّمَآءِ کا مطلب فوق السماء (آسمان کے اوپر) ہے کیونکہ فی کا معنی فوق بھی ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (التوبة : ٩/ ٢)

[1] مسلم، المساجد، تحریم الکلام فی الصلاۃ...... ح : ٥٣٧ .

[2] نبی کریم ﷺ کا واقعہ معراج بھی اللہ تعالیٰ کے اوپر ہونے کی ایک اہم اور عام فہم دلیل ہے۔ (شہباز حسن)

''زمین کے اوپر چلو۔''

اور اب آگے کوئی اگر یہ سوال کرے کہ کیف ھو؟ وہ کیسا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ کیف) کیسے) سے سوال اللہ کی صفت کے متعلق ہے وہ بلند صفات والا ہے۔

وہ عالم ہے جس کے پاس علم ہے۔ وہ قادر ہے اس کے پاس قدرت ہے۔ وہ زندہ ہے اس کے پاس حیات ہے۔ وہ ہمیشہ ان صفات میں منفرد رہے گا وہ کسی کے مشابہ نہیں رہے گا وہ کسی کے مشابہ نہیں ہوگا نہ کوئی چیز اس کے مشابہ ہوگی۔

اور اگر کوئی سوال اس کی ماہیت کے بارے میں کرے جیسا کہ جہمیہ نے کہا کہ ما ھو؟ تو اس سے یہ کہا جائے گا کہ لفظ ما سے سوال کسی چیز کی صفت یا جنس کے بارے میں ہوتا ہے تو اگر آپ کے سوال سے یہ مراد ہے تو اُس کی صفت علم ہے، قدرت ہے، کلام ہے، عزت ہے، بزرگی ہے اور اگر آپ جنس پوچھ رہے ہیں تو جواب یہ ہے کہ وہ جنس والا نہیں ہے اور اگر "ما ھو" سے آپ یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی طرف اشارہ کروتا کہ اس کا حواس کے ذریعے ادراک کرلیں تو جواب یہ ہوگا کہ انسان جو کچھ ادراک کرسکتا ہے حواس کے توسط سے کرسکتا ہے لیکن خدا محسوسات کے دائرے سے باہر ہے اس کے لیے ادراک کا کوئی ذریعہ اگر (ما ھو) سے آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کی حکمت کے آثار اور اس کی صنعت کے عجائب بتلاؤ تو وہ چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور اگر ما ھو سے یہ پوچھنا مقصود ہے کہ اس کا نام کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ ھو اللّٰہ (وہ اللہ ہے۔)

اگر سوال کیا جائے کہ وہ پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا تو جواب یہ ہے کہ لفظ (اَیْنَ) (کہاں) یہ مکان (جگہ) کا تقاضا کرتا ہے اور تمام جگہیں مخلوقات ہیں اور سبحانہ تعالیٰ پیدائش، جگہوں اور مکانوں سے قبل بھی تھا۔ لیکن نہ کسی مکان میں اور نہ کسی زمان میں۔ ﴿ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ﴾ (الحدید: ۵۷/ ۳) اول کا مطلب ہے لیس قبلہ شیء: اس کے پہلے کچھ نہیں تھا۔ آخر کا مطلب لیس بعدہ شیء: اس کے بعد بھی کچھ نہیں ہوگا۔

اور اگر یہ سوال ہوا کہ اس وقت وہ کہاں ہے تو جواب یہ ہوگا وہ عرش پر مستوی ہے:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ ﴾ (طٰہٰ : ۲۰/ ۵)

''وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔''

اب سوال یہ ہے کہ وہ عرش کا محتاج ہے کہ اگر عرش اس کے نیچے نہ رہے تو وہ گر جائے تو جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش تو کیا ساری چیزوں سے بے نیاز ہے وہ اپنی قدرت سے عرش اور عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کو سنبھالے ہوئے ہے۔

امام مالک سے کسی نے پوچھا کہ اللہ عرش پر کیسے مستوی ہے تو تھوڑی دیر آپ نے سر جھکایا اور فرمایا: استواء غیر مجهول والكيف غير معقول والايمان به واجب والسوال عنه بدعة . ''استواء معلوم ہے اور کیفیت نامعلوم ہے اور ایمان اس پر واجب ہے اور اس سلسلے میں سوال کرنا بدعت ہے۔''

اور آپ نے سائل سے فرمایا کہ مجھے تو گمراہ دکھائی دیتا ہے۔ ❶

اب سوال یہ ہے کہ عرش کہاں ہے؟ تو ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ درجہ ہے اور اس کی چھت اللہ کا عرش ہے۔ ❷

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ عرش تمام مخلوقات سے اوپر ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ آتا ہے، اللہ اترتا ہے تو اگر اس کے لیے نزول ہے تو لازم آئے گا کہ عرش اس سے خالی ہو جائے، دوسرے یہ لازم آئے گا کہ عرش اوپر ہو جائے اور اللہ (نعوذ باللہ) نیچے ہو جائے تو ائمہ سلف مکحول، زہری، اوزاعی، ابن مبارک، سفیان ثوری، لیث بن سعد، مالک بن انس، شافعی، احمد اور دیگر ائمہ نے احادیث نزول وغیرہ کے بارے میں بالاتفاق یہ فرمایا ہے کہ سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس کا علم اللہ ہی کو ہے اور اللہ ہی اس کی تاویل (حقیقت) جانتا ہے۔ اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس پر ایمان

❶ الاسماء والصفات للبيهقي، ص : ٤١١ .

❷ بخاري، الجهاد، درجات المجاهدين في سبيل الله، رقم : ٢٧٩٠ .

لانا کیسے صحیح ہوگا جس کی حقیقت کا علم ہمیں نہ ہو؟

جواب یہ ہے کہ جس طرح اللہ پر ملائکہ پر اور کتابوں، رسولوں، یوم آخرت جنت، جہنم پر ایمان لائے ہیں اسی طرح اس پر بھی ایمان لائیں گے اور ہمیں معلوم ہے کہ ان سب کا تفصیلی علم ہمیں نہیں ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ وہ اترتا ہے اور اس کا یہ اترنا اس کے جلال کے مطابق ہے۔

رویتِ باری تعالیٰ

حدیث میں ہے کہ تم اپنے رب کو قیامت کے دن اس طرح دیکھو گے جس طرح شمس و قمر کو دیکھتے ہو۔ ❶

تمھارے ساتھ رویت باری میں بخل نہیں کیا جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن اللہ کا دیدار ہوگا۔ قرآن میں ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (الانعام: ٦/ ١٠٣)

''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔''

آیت کریمہ میں ادراک کی نفی ہے مگر رویت کا اثبات کرتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ رویت باری ہوگی ادراک باری نہیں ہوسکتا کیونکہ ادراک کا مطلب ہے چیز کا مکمل احاطہ کرلینا۔ ابن عباس یا عکرمہ نے اس آدمی سے جس نے اس آیت کے ذریعہ معارضہ کیا تھا فرمایا تھا کہ کیا تو آسمان دیکھتا ہے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں؟ پوچھا پورا آسمان دیکھ رہے ہو تو وہ چپ ہوگیا۔ ❷

منکرین رویت باری یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر رویت باری کو ممکن تسلیم کرلیا جائے تو اللہ کا کسی جہت میں ہونا لازم آئے گا تو جواب یہ ہے کہ رویت اور معائنہ کے لیے مرئی کا کسی

---

❶ بخاری، الرقاق، الصراط جسر جهنم، رقم: ٦٥٧٣.

❷ السنة لابن ابی عاصم، رقم: ٤٣٤۔ اسے سماک بن حرب نے عکرمہ سے روایت کیا ہے اور سماک کی عکرمہ سے روایت ضعیف ہوتی ہے۔

جہت میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ مثلاً چراغ جلانے کے بعد ہمیں چراغ کی لو دکھائی دیتی ہے جبکہ چراغ کی لو کسی جہت میں نہیں ہے۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی آواز سنی تو کہہ بیٹھے:

﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ؕ﴾ (الاعراف: ۷/ ۱۴۳)

''میرے رب! تو مجھے دکھا، میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

تو جواب ملا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے یعنی دنیا کی فانی آنکھیں میرے دیدار کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ رویت باری ممتنع اور محال ہے ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت موسیٰ نے امر محال کا مطالبہ اللہ سے کیا جو سفاہت ہے اور نبی سے سفاہت کا صدور ناممکن ہے۔ جیسا کہ اشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾

(الاعراف: ۷/ ٦٧)

''اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں کوئی بے وقوفی نہیں اور لیکن میں سارے جہانوں کے رب کی طرف سے ایک رسول ہوں۔''

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارا رب اپنی پنڈلی کھول دے گا تو ہر مومن مرد اور ہر عورت سجدے میں گر پڑیں گی، ہاں جو لوگ دکھانے سنانے کے لیے سجدے کیا کرتے تھے وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن ان کی کمر تختہ ہوجائے گی۔ (یعنی وہ سجدہ نہ کرسکیں گے۔) [1]

توحید اور شرک

توحید کی ضد شرک ہے جس طرح توحید پر جنت کا وعدہ ہے اسی طرح شرک پر ہمیشہ کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ خالص توحید ہی دین فطرت ہے توحید پر شرک کا غبار آہستہ آہستہ جمتا ہے مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب آجاتا ہے

[1] بخاری، التفسیر، یوم یکشف عن ساق، رقم: ٤٩١٩.

جس سے بدیہی طور پر یہی نکلتا ہے کہ فطرت انسانی کو توحید سے مناسبت ہے ورنہ وہ اس کی طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے۔ یہ تو معلوم ہوگیا کہ توحید داخل فطرت ہے، تاہم یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرک کہاں سے آتا ہے؟ اگر جزو فطرت نہیں تو یہ بیماری کثیر الوقوع کیوں ہے اس کے لیے تفصیل میں جانے کے بجائے بطور اصل الاصول کے یہ جاننا کافی ہے کہ شرک کے دو سبب ہیں: غفلت اور دنائت۔

پہلا سبب عقلی ہے اور دوسرا اخلاقی اور یہ دونوں عدمی ہیں کیونکہ غفلت اسی کا نام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی عقل سے جو بہترین عطیۂ فطرت ہے کام نہ لے۔ عقائد میں اوہام باطلہ اور اعمال میں فوائد عاجلہ کی پیروی کرے اور دنائت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اشرف المخلوقات بنایا اور وہ مخلوق یعنی شجر و حجر اور دیگر چیزوں کی بندگی کرنے لگ جائے۔

قرآن معلم التوحید ہے

آریوں نے اپنی ناسمجھی سے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن میں شرک کی تعلیم ہے جیسا کہ قرآن میں ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تمام ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا۔ طرفہ یہ کہ شیطان بوجہ توحید کے جو اسے پہلے سے تعلیم ہوئی تھی سجدہ نہیں کیا تو اس کو مردود گردانا۔ سوال یہ ہے کہ آدم کا سجدہ عبودیت کا تھا یا کچھ اور؟ اگر عبودیت کا تھا تو بے شک قرآن معلم الشرک ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ یہ سجدہ جو فرشتوں سے کروایا گیا سجدۂ عبادت ہوتا تو شیطان اپنی معذوری اور جواب دہی میں یہ نہ کہتا:

﴿ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ ﴾

(ص: ۳۸/ ۷۶)

''میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔''

بلکہ صاف صاف اللہ سے یہ کہتا کہ جناب والا یہ کیا انصاف ہے کہ ہمیں ایک طرف تو شرک سے روکا جاتا ہے اور دوسری طرف شرک کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ شیطان تو بہت ہوشیار ہے، اسے یہ عذر ضرور ہی سوجھنا چاہیے تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سجدہ سجدۂ عبادت نہ تھا بلکہ

محض اس معنی میں تھا جیسے کسی سردار یا نواب و بادشاہ کو ماتحت لوگ ایک خاص وقت میں حاضر ہوکر سلام کیا کرتے ہیں جس میں اس سردار و بادشاہ کی رفعت اور ماتحتوں کی وفاداری کا ثبوت ہوتا ہے جو شیطان کو پسند نہ آیا۔

اللہ تعالیٰ بے مثال ہے

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ (الشوریٰ : ٤٢/ ١١)

''اس کے مثل کوئی چیز نہیں۔''

مذکورہ بالا آیت کریمہ کے ٹکڑے میں کسی نحو پڑھنے والے طالب علم کو شبہ ہوسکتا ہے کہ "كَمِثْلِهٖ" میں ''کاف'' حرف جار ہے جو تشبیہ کے لیے آتا ہے جیسے زیدٌ کالاسد (زید شیر کی طرح ہے) تو آیت کریمہ کے اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے مثل کی طرح کوئی چیز نہیں! اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ''کاف'' حرف جار کبھی تشبیہ کے لیے آتا ہے جیسا کہ مذکورہ مثال میں ہے کبھی تعلیل کے لیے آتا ہے جیسے ﴿اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ﴾ (البقرۃ : ٢/ ١٩٨) ''(اللہ) کو یاد کرو اس لیے کہ اس نے تم ہدایت کی۔''

اسی طرح کبھی تاکید کے لیے آتا ہے اس صورت میں یہ ''ک'' زائد ہوتا ہے۔ سورہ اخلاص کی چوتھی اور آخری آیت میں جو لفظ كُفُوًا استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی ہیں نظیر ،مشابہ، مماثل، مساوی، ہم رتبہ اس آخری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ساری کائنات میں کوئی نہ کبھی تھا نہ کبھی ہوسکتا ہے، جو اس کی ذات، صفات افعال، اختیارات میں اس سے مشابہت اور مماثلت رکھتا ہو۔ شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے ؏

دار فانی کی کوئی چیز نہیں
ہستیٔ لایزال کی صورت

مشابہت اور مماثلت میں فرق ہے:

① دو چیزیں ایک فرع میں شریک ہوں تو وہ مماثلت ہے جیسے زاہد، حامد انسانیت ہیں۔

② دو چیزوں کا اشتراک اگر وصف لازم ہو تو مشابہت ہے جیسے خالد اور شیر شجاعت

میں۔اسی طرح تشبیہ اور تمثیل میں بڑا فرق ہے،تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبہ اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے اور دونوں کے اجزاء کو ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دگر کتنی مطابقت پائی جاتی ہے پھر اسی مطابقت کے لحاظ سے اس سے تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے۔لیکن تمثیل میں اجزا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں ایک صورتِ واقعہ کو دوسری صورت واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے ایک صورت حال اور دوسری صورت حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے تو تمثیل مکمل ہے اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق نہ ہورہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لیے ضروری ہیں۔

مولانا عبدالمبین منظر رحمہ اللہ کے طالب علمی کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ دہلی کمپنی باغ میں طلبہ کچھ دینی مسائل پر بحث کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک آریہ آیا اور بولا کہ آپ لوگ خدا کا کلام قدیم مانتے ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ اللہ موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی؟ سب طلبہ نے اس کا جواب اثبات میں دیا تو اس نے کہ کہ تمہارا اللہ فرماتا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ (الشوریٰ : ٤٢/ ١١)

''اس کے مثل کوئی چیز نہیں۔''

تو سوال یہ ہے کہ مخلوق کے وجود میں آنے سے پہلے جب خدا کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی تو اس نے کس کے مقابلے میں کہا کہ میرے مثل کوئی چیز نہیں۔مثالی مقابلہ تو اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ سامنے دوسری چیز موجود ہو!

اس اعتراض سے اس آریہ کا مقصد یہ تھا کہ آریوں کا عقیدہ روح اور مادہ کے قدیم ہونے کا صحیح ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ کہ مخلوق کی پیدائش سے پہلے خالق کے سوا کوئی چیز نہ تھی غلط ہے۔تمام طلبہ اس سوال کے جواب میں حیران رہے کوئی کچھ کہتا اور کوئی کچھ بتاتا مگر جواب فٹ نہ ہوتا۔مولانا عبدالمبین منظر رحمہ اللہ جو اس وقت طالب علم تھے اور وہاں موجود تھے۔انھوں نے کہا کہ اس کا جواب میں دیتا ہوں تمہارے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ اللہ اس

ذات واجب الوجود کو کہتے ہیں جو تمام صفات کمالیہ کا جامع ہو ورنہ نقص لازم آئے گا۔ پس اس کی صفت کمال میں سے یہ بھی ہے کہ جو چیز ابھی وجود میں نہیں آئی اسے بھی موجود کی طرح دیکھے جیسے ہم اپنا گھر جو یہاں موجود نہیں دل کے آئینے میں دیکھ رہے ہیں اس کے علاوہ خالق بہرحال اپنی مخلوق سے افضل اور بے مثل ہوگا۔ پس ہر صورت میں مثلیت باطل اور بس ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ کا معاملہ صحیح ہوگا یہ جواب سن کر آریہ متحیر ہوگیا اور اس سے کوئی بات نہ بن آئی۔

امکان کذب باری محال ہے

اگر کوئی شخص امکان کذب باری کے ثبوت میں دلیل پیش کرتے ہوئے یوں کہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (البقرۃ: ۲/ ۲۰)

''بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

اور جھوٹ بولنا بھی ایک چیز ہے لہٰذا اللہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے اور جب وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہے تو جھوٹ بولنا اس کے لیے ممکن ہوا جس سے ثابت ہوا کہ مسئلہ امکان کذب الٰہی برحق ہے۔

جواب:..... اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا محال ہے۔ اسے ہم برہان قطعی [1] سے ثابت کر رہے ہیں۔ قیاس کی صورت یوں ہوگی۔

جھوٹ بولنا عیب ہے (صغریٰ) اور ہر عیب اللہ تعالیٰ پر محال بالذات ہے (کبریٰ) لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ جھوٹ بولنا اللہ پر محال بالذات ہے۔ مذکورہ مثال میں مقدمہ اولیٰ یعنی صغریٰ عقلی بدیہی ہے اور مقدمہ ثانیہ یعنی کبریٰ عقلی نظری ہے۔

---

[1] برہان علم منطق میں اس قیاس کو کہتے ہیں جو صرف مقدماتِ یقینیہ سے مرکب ہو خواہ سب مقدمات بدیہی ہوں یا سب نظری یا بعض بدیہی ہوں اور بعض نظری۔ یوں ہی سب عقلی ہوں یا سب نقلی یا بعض عقلی اور بعض نقلی۔

برہان قطعی سے یہ ثابت ہو چکا کہ اللہ کا جھوٹ بولنا محال ہے۔ اب دوسرے قیاس کی صورت یوں ہوگی:

اللہ کا جھوٹ بولنا محال ہے (صغریٰ) اور کوئی محال زیر قدرت نہیں (کبریٰ) نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا زیرِ قدرت نہیں۔

اور جب اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا زیر قدرت نہیں (کبریٰ) نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا زیر قدرت نہیں۔

اور جب اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا زیر قدرت نہیں تو اس کا جھوٹ بولنا ممکن نہیں اور جب ممکن نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مسئلہ امکان کذب باری باطل محض ہے۔

شرح عقائد جلالی میں ہے:

"الكذب نقص والنقص عليه محال فلا يكون من الممكنات ولا تشمله القدرة"

''یعنی جھوٹ بولنا عیب ہے اور عیب اللہ تعالیٰ پر محال ہے لہٰذا جھوٹ بولنا ممکن نہیں اور نہ وہ زیر قدرت ہے۔''

شرح مواقف میں ہے:

"لانها تختص بالممكنات دون الواجبات والممتنعات"

''قدرت الٰہیہ، صرف ممکنات سے متعلق ہے، واجبات اور محالات سے نہیں اور جب ثابت ہو گیا کہ زیر قدرت صرف ممکنات ہیں۔''

تو آیت کریمہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (البقرۃ: ۲/ ۲۰) میں "کل شیء" سے مراد کل ممکن ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ ہر ممکن زیرِ قدرت الٰہی ہے اور چونکہ اللہ کا جھوٹ بولنا ممکن نہیں اس لیے وہ اس کل شیء میں داخل نہیں رہا۔ آیت مقدسہ ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ کا ارشاد تو اس میں کل شیء سے مراد کل مفہوم ہے لہٰذا اس کل شیء میں واجب، ممکن، محال، قدیم، حادث، کلی، جزئی، موجود، معدوم، مفروض، موہوم

سب داخل ہیں۔ کیونکہ جہاں تک علم الٰہی کی بات ہے وہ ممکن واجب، محال وغیرہ سب کو شامل ہے۔

جیسا کہ شرح مواقف میں ہے:

"علمه تعالٰی یعم المفهومات کلها الممکنة والواجبة والممنعة فهو اعم من القدرة"

''یعنی علم الٰہی ممکن، واجب، محال، سب کو شامل ہے علم الٰہی قدرت الٰہیہ سے عام ہے۔''

واضح ہو کہ مناطقہ مفہوم کی تین قسمیں کرتے ہیں: واجب، ممکن، محال۔

واجب [1]:..... وہ ہے جس کا وجود ضروری ہو جیسے ذات باری۔

ممکن:..... وہ ہے جس کا نہ وجود ضروری ہو نہ عدم جیسے تمام مخلوقات۔

محال:..... وہ ہے جس کا عدم ضروری ہو یعنی جو وجود کو قبول نہ کر سکے جیسے شریک باری تعالٰی۔

معطلہ اور مشبہہ کا رد

معطلہ جو امت کا ایک گمراہ فرقہ ہے وہ ذات باری سے تمام صفات کی نفی کرتا ہے ہم ان سے یہ سوال کریں گے کہ صفات کے انکار سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ سے وجود کی بھی نفی کر دی جائے کیونکہ وجود بھی تو ایک صفت ہے اور اگر آپ ذات باری کو وجود کی صفت سے متصف مانتے ہیں تو دیگر صفات سے انکار کیوں؟

آریوں کا بھی یہی حال تھا، جب ان سے توحید کے سلسلے میں گفتگو ہوتی تو فوراً یہ کہتے کہ خدا بھی موجود ہے اور ہم بھی موجود ہیں یہ تو شرک ہو گیا جس کا جواب مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ نے یہ دیا تھا کہ خدا جس معنی میں موجود ہے اس معنی میں کوئی موجود

[1] جاننا چاہیے کہ واجب یہ اللہ کے اسمائے حسنٰی میں سے کوئی اسم نہیں یہ مناطقہ کا گھڑا ہوا لفظ ہے۔ اسی طرح قدیم وحادث اصطلاح بھی انہیں کی اختراع ہے۔ (جلال الدین قاسمی)

نہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس معنی میں کسی نبی یا رسول کو موجود مانے گا تو مشرک ہو جائے گا۔

خدائے تعالیٰ تو اپنے اصلی اور حقیقی وجود سے اور کائنات کی دوسری چیزیں اس کی ایجاد سے موجود ہیں اور صرف اتنے ہی وقت تک موجود ہیں جب تک وہ ہمیں موجود رکھے۔ اس لیے ہماری مثال بالکل ٹرین کے ڈبوں اور انجن کی سی ہے۔ انجن حرکت سے متصف ہے اور ڈبے بھی حرکت سے متصف ہیں مگر عقلمند ان دونوں حرکتوں میں تمیز کرسکتا ہے کہ انجن کی حرکت اور ہے اور ڈبوں کی حرکت اور۔ انجن کی حرکت حقیقی اور اصلی ہے اور ڈبوں کی حرکت طفیلی۔ دونوں حرکتوں کو یکساں کہنا کسی عقلمند کا کام نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اللہ موجود ہے بغیر کسی ایجاد کے اور ہم موجود ہیں اللہ کی ایجاد سے۔

وجود باری پر بحث

قدماء اللہ کے وجود پر اس طرح استدلال کرتے ہیں۔ "العالم متغیر وکل متغیر حادث فالعالم حادث" کہ عالم تغیر پذیر ہے اور وہ ہر چیز جو تغیر کو قبول کرے اور تبدیلی کا محل بنے وہ حادث اور مخلوق ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عالم حادث و مخلوق ہے اور ہر مخلوق کے لیے کسی خالق کا ہونا ضروری ہے اور اسی کو ہم اللہ کہتے ہیں۔ اس استدلال پر ایک اعتراض ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عالم کی تمام چیزیں دو چیزوں کا مجموعہ ہیں۔ (۱) مادہ (۲) صورت تغیر پذیر صورت ہے اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ عالم کو حادث ماننا صورت کے اعتبار سے تو صحیح ہے مگر مادے کے اعتبار سے حادث ماننا صحیح نہیں ہے۔ ارسطو نے اسی اعتراض سے بچنے کے لیے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ وہ یوں استدلال کرتا ہے کہ عالم کے تمام اجزاء متحرک ہیں کیونکہ اجسام گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور جو چیز متحرک ہو ضرور ہے کہ اس کے لیے کوئی محرک ہو۔

بوعلی سینا کہتا ہے کہ عالم قدیم بھی ہے اور خدا کی مخلوق بھی، اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ جب عالم اور خداوند دونوں قدیم اور ازلی ہیں تو ایک کو علت اور دوسرے کو معلول کیسے کہا جاسکتا ہے کیونکہ علت اور معلول میں زمانہ کا تقدم اور تاخر ضروری ہے۔ جس کا جواب بوعلی سینا

نے یوں دیا کہ علت کے لیے تقدم بالذات کافی ہے تقدم زمانی ضروری نہیں مثلاً کنجی کی حرکت تالے کے کھل جانے کی علت ہے لیکن کنجی کی حرکت اور تالے کے کھل جانے میں ایک لحظے کا بھی آگا پیچھا نہیں۔

اس دلیل سے ایک علۃ العلل (Cause of the causes) کا وجود تو ثابت ہو جاتا ہے لیکن علت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس سے معلول بہ ارادہ اور بہ اختیار صادر ہو۔ مثلاً ''آفتاب'' روشنی کی علت ہے لیکن آفتاب کو نہ علم ہے نہ ارادہ ہے بلکہ روشنی اس سے بلاعلم و ارادہ صادر ہو رہی ہے۔

ملاحدہ اور مادیین کہتے ہیں کہ مادہ خود بخود پیدا ہوا مادہ کے ساتھ حرکت پیدا ہوئی، حرکت نے امتزاج پیدا کیا پھر رفتہ رفتہ قوانین قدرت پیدا ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کا وجود وہمی اور خیالی ہے، اس کے وجود کا عقیدہ رکھنا سراسر حماقت ہے! لیکن ہم یہ سوال کریں گے کہ کائنات میں سینکڑوں لاکھوں قوانین قدرت ہیں ان میں توافق اور تناسب کہاں سے آیا توافق اور اتحاد خود ان قوانین کی ذاتی خاصیت نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو یہ ایک فرضی احتمال ہوگا جس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کمزور سے کمزور گھاس اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک خاک، ہوا، پانی سے لے کر آفتاب و ماہتاب کے افعال وخواص اس کے پیدا کرنے میں مشارکت اور توافق کو عمل میں نہ لائیں اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جس طرح انسان کے اعضاء و جوارح الگ الگ ہیں اور ہر ایک کا کام جدا جدا ہے لیکن کوئی عضو اس وقت تک کام نہیں کرسکتا جب تک تمام اعضاء بالذات یا بواسطہ اس کے عمل میں شریک نہ ہوں یا کم از کم اس عضو کے عمل میں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

خلاصہ سورہ اخلاص

- اللہ کے وجود کا منکر کا ابطال لفظ ''ھو'' سے کیا گیا ہے۔ یہ لفظ ذات پر دلالت کرتا ہے یعنی وہ ہستی جسے قرآن ''اللہ'' سے تعبیر کرتا ہے فی الحقیقت موجود ہے اس کا وجود وہمی و خیالی نہیں ہے۔

- اللہ کی ذات کے اول ہونے کے منکر کا ابطال لفظ ''اللہ'' سے کیا گیا ہے کیونکہ اللہ کا لفظ قرآن میں صرف اسی ہستی پر بولا جاتا ہے جو رب العالمین ہے یعنی ساری کائنات کا خالق، رازق، منتظم، مالک اور ہر چیز کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ساری کائنات مخلوق ہے اور اللہ اس کا تنہا خالق ہے۔
- منکر توحید کا ابطال "احـــد" سے کیا گیا ہے یعنی اللہ ایسا ''ایک'' ہے کہ اس جیسا دوسرا نہیں ہے یعنی یکتا لا نظیر له و لا مثیل له و لا شریك له ہے۔
- مشرک فی الصفات، مشرک فی العبادات، مشرک فی الاستعانۃ اور مشرک فی الحکم ان چاروں گروہوں کا ابطال لفظ ''صمد'' سے کیا گیا ہے۔
- قائلین ابنیت (اللہ کا بیٹا یا بیٹی ہے) کا ابطال ''لَمْ یَلِدْ'' سے کیا گیا ہے۔
- معتقدین الوہیت (فلاں شخص اوتار ہے جیسے ہندو رام کرشن وغیرہ کو اوتار مانتے ہیں) کا ابطال "ولم یولد" سے کیا گیا ہے۔
- معتقدین مماثلت (فلاں شخص یا ہستی بھی خدا ہے یا اس کی ہمسر ہے) کا ابطال ﴿ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ سے کیا گیا ہے۔

قارئین کرام خوب غور سے دیکھ لیں انکار یا شرک کی یہی مذکورہ بالا صورتیں ہیں جو نزول قرآن کے وقت دنیا میں پائی جاتی تھیں کتاب اللہ کی اس مختصر سورہ کا اعجاز غور طلب ہے کہ دو سطروں میں سارے جہاں کے عقائد باطلہ کا رد کر دیا ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ

مؤلف کی تحریری کاوشیں

۱: احسن الجدال بجواب راہ اعتدال
۲: ردتقلید، قرآن وحدیث اور اقوال ائمہ وعلماء کی روشنی میں
۳: رفع الشکوک والاوہام بجواب ۱۲ مسائل ۲۰ لاکھ انعام
۴: دل (قلب کی ماہیت) ۵: تفسیر آیت الکرسی
۶: تفسیر سورۃ اخلاص ۷: عورت اور اسلام
۸: پیارے نبی ﷺ کی پانچ پیاری نصیحتیں ۹: مختصر تاریخ اہل حدیث
۱۰: یا ایھا الذین اٰمنوا کی تفسیر ۱۱: حجیت حدیث در رد موقف انکار حدیث
۱۲: گناہوں کی بخشش کے دس اسباب
۱۳: اپنے بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ۱۰ وصیتیں (زیر طبع)
۱۴: مقاصد وتراجم ابواب بخاری (زیر طبع)
۱۵: نکات قرآن (۲ جلدیں۔ایک ہزار صفحات) (زیر طبع)

ڈاکٹر حافظ محمد شہباز حسن کی تحریری کاوشیں

۱: فتاویٰ افکارِ اسلامی، ۳۱۳ سوالات کے جوابات
۲: تفسیر معارف البیان، سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ (۱۔۵۰ آیات کی تفسیر)
۳: مظلوم صحابیات رضی اللہ عنہن ظلم وناانصافی کا شکار ہونے والی عورتوں کے لیے اسوہ صحابیات
۴: شوقِ عمل، ارکانِ اسلام پر عمل کی ترغیب ۵: شوقِ جہاد
۶: سجدۂ تلاوت کے احکام اور آیاتِ سجدہ کا پیغام، اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب
۷: پریشانیوں اور مشکلات کا حل (حافظ حمزہ کاشف/شہباز حسن)
۸: بدعات کا انسائیکلوپیڈیا (قاموس البدع کا ترجمہ واستدراک)
۹: صداقت نبوتِ محمدی (دلائل النبوۃ از ڈاکٹر منقذ بن محمود السقار کا ترجمہ وتعلیق)
۱۰: غسل، وضو اور نماز کا طریقہ مع دعائیں (الوضوء و الغسل و الصلاۃ کا ترجمہ وتعلیق)
۱۱: مقامِ قرآن (میاں انوار اللہ/شہباز حسن)
۱۲: عُلوم اسلامیہ (پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد اسرائیل فاروقی/شہباز حسن)
۱۳: اسلامی تعلیمات (پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد اسرائیل فاروقی/شہباز حسن)
۱۴: لغت عرب کے ابتدائی قواعد اور جدید عربی بول چال مع قصص النّبیین
۱۵: جنت کا منظر (حافظ حمزہ کاشف/شہباز حسن)

۱۶: دوزخ کا منظر (حافظ حمزہ کاشف/شہباز حسن) ۱۷: مساجد کی آبادکاری اور بربادی
۱۸: جہنم اور جہنمیوں کے احوال (النار حالها و احوال اهلها کا ترجمہ وتعلیق)
۱۹: خوش نصیبی کی راہیں (طریق الهجرتین از حافظ ابن قیم کا ترجمہ اور تلخیص وتعلیق)
۲۰: تفسیر میں عربی لغت سے استدلال کا منہج (اسلامیات میں پی ایچ ڈی کا مقالہ (زیرِطبع)
۲۱: جنت میں خواتین کے لیے انعامات (احوال النساء فی الجنة کا ترجمہ وتعلیق)
۲۲: اسلام کے بنیادی عقائد ونظریات اور اعمال واداب، شرح اربعین نووی (زیرِطبع)
۲۳: فرقہ پرستی کے اسباب اور ان کا حل (الافترق۔اسبابها و علاجها کا ترجمہ وتعلیق) (زیرِطبع)
۲۴: دنیا ڈھلتی چھاؤں (الدنیا ظل زائل کا ترجمہ) (زیرِطبع)
۲۵: انسان اور قرآن (میاں انواراللہ/شہباز حسن) (زیرِطبع)
۲۶: التأثیر الاسلامی فی شعر حالی (عربی زبان وادب میں عربی مقالہ) (زیرِطبع)
۲۷: اصول الکرخی (ترجمہ)

نظر ثانی شدہ کتب

۱۔ اردو ترجمہ قرآن مجید از مولانا محمد ارشد کمال
۲۔ صحیح ابن خزیمہ (ترجمہ وشرح) ۳۔ مشکوٰۃ المصابیح (ترجمہ)
۴۔ حدیث اور خدام حدیث از میاں انواراللہ ۵۔ الاسماء الحسنیٰ از میاں انواراللہ
۶۔ المسند فی عذاب القبر از مولانا محمد ارشد کمال
۷۔ عذاب قبر، قرآن کی روشنی میں از مولانا ارشد کمال
۸۔ ذکراللہ کے فوائد از پروفیسر عنایت اللہ مدنی ۹۔ حقانیت اسلام، از پروفیسر محمد انس
۱۰۔ تقلید کی شرعی حیثیت (تخریج وتحقیق اور اضافہ شدہ) از حافظ جلال الدین قاسمی
۱۱۔ منکرین حدیث کی مغالطہ انگیزیوں کے علمی جوابات (تخریج وتحقیق اور اضافہ شدہ) از حافظ جلال الدین قاسمی
۱۲۔ گناہوں کی معافی کے دس اسباب (تخریج وتحقیق اور تعلیقات کے ساتھ) از حافظ جلال الدین قاسمی
۱۳۔ اللہ تعالیٰ کی دس تاکیدی نصیحتیں (از حافظ جلال الدین قاسمی)
۱۴۔ سورۃ الاخلاص کا پیغامِ توحید (از حافظ جلال الدین قاسمی)
۱۵۔ آیت الکرسی اور عظمت الٰہی (از حافظ جلال الدین قاسمی)
۱۶۔ اصول کرخی پر ایک نظر (مولانا محمد ارشد کمال، مولانا یحییٰ عارفی)
۱۷۔ توبہ کا دروازہ (میاں انواراللہ)
۱۸۔ اسلامی عقائد۔ دو مسلمانوں کا مکالمہ (وارثان انبیاء)